سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں نشاط فاطمہ کی افسانہ نگاری: تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

مدیحہ عنایت

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۱ء

سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں نشاط فاطمہ کی افسانہ نگاری: تجزیاتی مطالعہ

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

مقالہ نگار:

مدیحہ عنایت

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۱ء

مقالے کے دفاع کی منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں نشاط فاطمہ کی افسانہ نگاری: تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: مدیحہ عنایت رجسٹریشن نمبر:1570/M/U/F18

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر شفیق انجم _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر صوفیہ لودھی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ:_____

اقرار نامہ

میں، مدیحہ عنایت حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کی ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر شفیق انجم کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

مدیحہ عنایت

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ کے دفاع کی منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
Abstract	viii
اظہار تشکر	x
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف: تمہید	۱
۱۔ موضوع کا تعارف	۱
۲۔ بیان مسئلہ	۱
۳۔ تحقیقی مقاصد	۲
۴۔ تحقیقی سوالات	۲
۵۔ نظری دائرہ کار	۲
۶۔ تحقیقی طریقہ کار	۳
۷۔ زیر نظر موضوع پر ما قبل تحقیق	۳
۸۔ تحدید	۳
۹۔ پس منظری مطالعہ	۳

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت ۴

ب) سقوط ڈھاکہ: تاریخی تناظر ۴

ج) اردو افسانے میں سقوط ڈھاکہ: پس منظری مطالعہ ۱۱

د) نشاط فاطمہ: سوانحی و ادبی آثار ۲۴

حوالہ جات ۲۸

باب دوم: سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں نشاط فاطمہ کی افسانہ نگاری: واقعاتی تناظر میں تجزیاتی مطالعہ ۳۱

الف) سقوط ڈھاکہ سے پہلے کے واقعات اور صورتحال ۳۱

ب) ہجرت کے واقعات ۴۴

ج) فسادات کے واقعات ۵۶

حوالہ جات ۸۰

باب سوم: سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں نشاط فاطمہ کی افسانہ نگاری: کرداری تناظر میں تجزیاتی مطالعہ ۸۴

الف) مرد کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ ۸۷

ب) نسوانی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ ۱۲۰

حوالہ جات ۱۴۹

باب چہارم: ماحصل ۱۵۴

الف۔ مجموعی جائزہ ۱۵۴

ب۔ تحقیقی نتائج ۱۵۸

ج۔ سفارشات ۱۵۹

کتابیات ۱۶۰

ABSTRACT

This title of my M.Phil thesis is "*Saqoot e Dhaka kay Tanazar main Nishat Fatima ki Afsana Nigari: Tajzyati Mutaleha*". The fall of Dhaka was such a tragedy in the history of Pakistan which has created a sense of intense shame and humiliation in the eyes of Pakistani nationalists. The conflicts emerged between two groups of the same nation on regional basis and these conflicts gave birth to a clash of civilization which affected the national and individual life of every patriotic Pakistani.Pakistanis were badly hurt by the fall of Dhaka in 1971. The national and individual life of persons got affected as a result of this tragedy. Because of deep connection between literature and life the effects of this tragedy are visible in the literature too. This thesis is based on *Nishat Fatima's* fictions "*Insaan ki Talash & Chand Doob gaya*".In this thesis the analytical study of *Nishat Fatima's* fiction writing based on the fall of Dhaka in the light of events and characters bring surfaces many more bitter realities before audience related to fall of Dhaka. This paved the way to a noteworthy tragedy in to fall of Dhaka. These faults gave rise to moral downfall and social destruction. *Nishat Fatima* has described this situation of Pakistani society in her fictions in literary framework. There is diversity of themes (topics) in *Nishat Fatima's* writings. However, this thesis focuses specifically on analytical study of *Nishat Fatima's* fictional writing with a backdrop of fall of Dhaka. The other themes have been excluded in this study.This thesis focuses only on Nishat Fatima's fictions "*Insaan ki Talash & Chand Doob gaya*". To grasp the documented and fundamental origins *Nishat Fatima's*

fictional collection is explored. Different books have been included in this study to get awareness of *Nishat Fatima's* life and person. Different books, research periodicals, journals and thesis along with other books on fall of Dhaka are included in this study as secondary sources. To gain access of additional books public sector, institutional and private libraries were approached. *Nishat Fatima* is included in important fiction writers in Urdu literature. Like other writers she also possessed an immense ability to observe contemporary issues. On the basis of her experiences she also wrote on fall of Dhaka. In the on going study the fall of Dhaka has been focused with specificity in *Nishat Fatima's* fictions. This study brings surfaces the fall of Dhaka in a unique style before readers as observed by *Nishat Fatima*. Due to this some unaddressed anecdotes related to fall of Dhaka are exposed before readers. Like other writers she also possessed an immense ability to observe contemporary issues.Along with projection of contemporary circumstances *Nishat Fatima* has exposed fall of Dhaka in her writings too. There is dire need to analyze her writings with different angles. This study is an attempt in this context.

اظہارِ تشکر

اس مقالے کی تکمیل میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر روبینہ شہناز، کو آرڈینٹر ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر محمود الحسن، انتہائی واجب الاحترام اساتذہ کرام اور خصوصاً اپنے نگران مقالہ جناب ڈاکٹر شفیق انجم صاحب کی بے حد ممنون شکر گزار ہوں کہ انھوں نے شفقتوں سے نوازا اور ہر لمحہ میری حوصلہ افزائی کی۔ مقالے کے موضوع سے لے کر خاکہ کی تیاری اور تکمیل تک مجھے جن مشکلات کا سامنا رہا، میرے استاد محترم ڈاکٹر شفیق انجم صاحب نے آسان کر دیا اور ان کی رہنمائی اور مہربانی سے مقالہ لکھنے کے سلسلے میں آنے والی دشواریاں رفتہ رفتہ میرے لیے آسان ہوتی چلی گئیں۔ جس کے لیے میں ان کی بے حد مشکور ہوں اور ہمیشہ دعا گو رہوں گی۔ اس مقالے کی تیاری میں شعبہ اردو کے جن دیگر دوست احباب اور عزیزوں کا تعاون حاصل رہا ان سب کی احسان مند اور شکر گزار ہوں۔ اپنے والدین اور عزیز رشتہ داروں کی بے حد ممنون شکر گزار ہوں کہ جن کی محبت اور مسلسل دعاؤں سے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔

میں اپنے رب کی سب سے زیادہ شکر گزار ہوں اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ جس نے میری دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا اور مجھے سرخرو کیا۔

مدیحہ عنایت

سکالر ایم فل اُردو

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

۱-موضوع کا تعارف

زیرِ نظر ایم۔فل اردو کے مقالے کا مجوزہ موضوع "سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں نشاط فاطمہ کی افسانہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ "ہے۔نشاط فاطمہ ایک منفرد ناول نگاراور افسانہ نگار ہیں۔ان کے ہاں عصری مسائل کے مشاہدے کی زبردست صلاحیت پائی جاتی ہے۔ان کی تحریروں میں تنوع پایا جاتا ہے۔جن میں فرد کے مسائل، فرسودہ رسم ورواج، نفسیاتی وسماجی مسائل، حقوقِ نسواں، حب الوطنی، لے پالک اولاد کے مسائل اور تقسیم ہند جیسے موضوعات اہم ہیں۔

نشاط فاطمہ نے اپنے افسانوں کے اندر جہاں دیگر مسائل کی عکاسی کی ہے وہاں سقوط ڈھاکہ کے دوران پیش آمدہ مسائل اور ہجرت کے المیے کو نمایاں طور پر اجاگر کیا ہے۔انہوں نے ان بنیادی مسائل کی طرف توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی ہے جو بظاہر معمولی نظر آتے ہیں لیکن ان کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔اس عظیم سانحے کے دوران اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کی عکاسی انھوں نے افسانوں میں اس انداز سے کی ہے کہ اس دور کی سچی اور حقیقی تصویر سامنے آجاتی ہے

۲۔بیان مسئلہ

نشاط فاطمہ اپنے عہد اور سماج کے مسائل کو اپنا موضوع بناتی ہیں اور اہم سماجی ، نفسیاتی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی بڑی ہنرمندی سے کرتی ہیں۔انھوں نے تسلسل کے ساتھ مشرقی پاکستان کے المیے اور ہجرت کے مصائب پر لکھا۔زیر نظر مقالے میں خصوصیت کے ساتھ سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ان کے افسانوں کو زیر بحث لایا گیا ہے تاکہ ان افسانوں کی اہمیت وانفرادیت واضح ہو سکے۔

۳۔ مقاصد تحقیق

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں۔

i. سقوط ڈھاکہ کے تاریخی اور ادبی تناظر کو زیر بحث لانا۔

ii. نشاط فاطمہ کے افسانوں میں سقوط ڈھاکہ کے اسباب، پس منظر اور پیش منظر کا جائزہ لینا۔

iii. نشاط فاطمہ کی سقوط ڈھاکہ سے متعلق کہانیوں کا سماجی تناظر میں جائزہ لینا۔

۴۔ تحقیقی سوالات

i. سقوط ڈھاکہ کا تاریخی اور ادبی تناظر کیا ہے؟

ii. نشاط فاطمہ کے افسانوں میں سقوط ڈھاکہ کا پس منظر کیا ہے؟

iii. نشاط فاطمہ کے افسانوں میں سقوط ڈھاکہ کے واقعات اور کرداروں کی تفصیلات کیا ہیں؟

۵۔ نظری دائرہ کار

سقوط ڈھاکہ ایک عظیم سانحہ تھا جس نے پاکستانیت سے وابستہ ہر شخص کو متاثر کیا ہے۔ ادب میں اس سانحہ پر بہت تواتر سے لکھا گیا۔ ان لکھنے والوں میں عینی شاہدین بھی تھے۔ نشاط فاطمہ کا تعلق اسی قبیل سے ہے۔ انھوں نے سانحے سے قبل اور دوران کے حالات وواقعات کو بہت قریب مشاہدہ کیا اور اسے قلم بند ہے۔ سقوط ڈھاکہ پر ان کے افسانوں کے تجزیے کے لیے اس موضوع پر لکھی گئی دیگر افسانوی تحریروں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً انتظار حسین، مسعود مفتی، رضیہ فصیح احمد، مسعود اشعر، مسعود مفتی، الطاف فاطمہ اور شہزاد منظر وغیرہ۔ مزید بر آں غیر افسانوی تجزیے، جائزے اور رپورتاژ بھی ملحوظ رہیں ہیں۔ خاص طور پر صدیق سالک کی کتاب "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا" اور ڈاکٹر صفدر محمود کی کتب "سقوط مشرقی پاکستان" اور " پاکستان کیوں ٹوٹا" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار

زیر نظر مقالے میں نشاط فاطمہ کے افسانوی مجموعے "انسان کی تلاش" اور "چاند ڈوب گیا" پر انحصار کیا گیا ہے۔ دستاویزی اور بنیادی ماخذ تک رسائی کے لیے نشاط فاطمہ کے افسانوی مجموعے حاصل کیے گئے ہیں۔ بنیادی ماخذ تک رسائی کے بعد نشاط فاطمہ کی حالات زندگی اور شخصیت سے آگاہی کے لیے کتب نیز ان کے احباب اور دیگر ادیبوں سے انٹرویوز کو بھی شامل تحقیق کیا گیا ہے۔ انٹرویوز، تحقیقی رسائل وجرائد کے ساتھ ساتھ افسانوی مجموعے اور کتب کا مطالعہ بھی شامل تحقیق رہا۔ مزید کتب تک رسائی کے لیے سرکاری، جامعاتی اور نجی کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

نشاط فاطمہ کی ناول نگاری پر ایم فل کی سطح کا تحقیقی کام ہو چکا ہے تاہم سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں نشاط فاطمہ کی افسانہ نگاری: تجزیاتی مطالعہ کا موضوع نیا اور ہنوز تحقیق طلب ہے۔ ناولوں پر کام درج ذیل ہے:

۱۔ امبر شہزادی، نشاط فاطمہ کے ناولوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ۲۰۱۳ء، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

۸۔ تحدید

نشاط فاطمہ کے متعدد ناول اور افسانے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں نشاط فاطمہ کے چودہ افسانوں پر مشتمل دو تصانیف "انسان کی تلاش" اور "چاند ڈوب گیا" میں سقوط ڈھاکہ کے موضوع پر مبنی مباحث کو مذکور کیا گیا ہے۔ ان کے ناولوں کا مطالعہ اس تحقیق میں شامل نہیں۔

۹۔ پس منظری مطالعہ

اردو ادب کی روایت میں سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں نمایاں لکھنے والوں میں رضیہ فصیح احمد، ابراہیم جلیس، اختر جمال، فرخندہ لودھی، اے خیام، انور عنایت اللہ، انتظار حسین، اے حمید، وغیرہ کے نام نمایاں ترین ہیں۔ پس منظری مطالعے کے طور پر اردو افسانوی ادب میں سقوط ڈھاکہ کے متعلق لکھے گئے افسانوں اور متعلقہ تنقیدی حوالوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت

نشاط فاطمہ اپنے معاصر ادبی منظر نامے میں ایک معتبر مقام کی حامل نمایاں لکھاری ہیں۔ ان کے ہاں اپنے دور کے اہم مسائل کی باریک بینی سے مشاہدے اور اس کے بے باک اظہار کی صلاحیت موجود ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے اپنے دور کے حالات کی شاندار عکاسی کی ہے۔ تاہم ان کی ادبی خدمات وقت کی دھند میں چھپ گئی ہیں جس کے باعث ان کے کام کو ان کی قابلیت کے شایانِ شان سراہا نہیں گیا۔ ضرورت ہے کہ ان کی تحریروں کا تجزیہ کر کے ان کے کام پر مختلف جہات سے تحقیق کی جائے۔ یہ مقالہ اسی سلسلے کی ایک کاوش ہے۔

ب: سقوط ڈھاکہ: تاریخی تناظر

قیامِ پاکستان کی اساس دو قومی نظریے پر استوار ہے۔ اپنی تشکیل کے وقت یہ ملک مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان پر مشتمل دو حصّوں پر مشتمل تھا، جن کے مابین تقریباً ایک ہزار میل کا زمینی فاصلہ تھا۔ افتخار علی شیخ لکھتے ہیں:

> "وطن عزیز دو حصّوں میں بٹا ہوا تھا۔ مغرب میں واقع چاروں صوبوں اور مشرقی صوبے کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلہ تھا وہ بھی ہوائی جہاز کے راستے۔ خشکی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ درمیان میں بھارت واقع تھا۔ جو ہر طرح پاکستان کے دونوں حصّوں کے درمیان فاصلہ بڑھانے میں کوشاں تھا۔"(۱)

متحدہ ہندوستان کی ہندو اشرافیہ ابتدا ہی سے قیام پاکستان کی مخالف تھی۔ چنانچہ انہوں نے تقسیم ہندوستان کو دل سے قبول ہی نہ کیا۔ وہ آئے روز پاکستان کو ختم کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ اس وجہ سے قیام پاکستان کے وقت ابتدائی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے عوام میں دوریاں پیدا کرنے کے لیے دشمن نے باہمی اختلافات کو ہوا دی۔ ڈاکٹر صفدر محمود لکھتے ہیں:

> "قیام پاکستان کے فوراً بعد ملک کے مختلف حصّوں میں صوبائیت کے رجحانات منظر عام پر آنے لگے اور ڈھاکہ میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک گہری دشمنی پروان چڑھنے لگی۔ بائیں بازوں کے سیاست دانوں نے صوبائی خود مختاری کے مسئلے سے

بھرپور فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے عوامی مقبولیت کے میدان میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے اس مسئلے کو استعمال کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔"(۲)

نسلی، لسانی، جغرافیائی، اقتصادی اور ثقافتی اختلافات کی آڑ میں نفرت کے بیج بونے والی طاقتوں نے آہستہ آہستہ پاکستان کو داخلی سطح پر کمزور کر دیا۔ تقسیم ہند کے وقت مشرقی پاکستان میں مقیم افراد ملک کی مجموعی آبادی کے ۵۶ فیصد حصّے پر مشتمل تھے۔ ملکی برآمدات کا بیشتر حصّہ مشرقی پاکستان پر منحصر تھا۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی جغرافیائی صورتحال اور تاریخی، نسلی اور معاشی انفرادیت کے حوالے سے مختلف اہلِ علم و دانش نے قلم اٹھایا ہے جن میں شریف الحق، صدیق سالک، انور رضا، ڈاکٹر صفدر محمود، زاہد چوہدری، نمایاں ناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ زاہد چوہدری اس ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

"مغربی پاکستان اور مشرقی بنگال کے درمیان نہ صرف فاصلہ بہت زیادہ تھا بلکہ ملک کے ان دونوں علاقوں میں جغرافیائی، تاریخی، نسلی، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی لحاظ سے بھی زمین و آسمان کا فرق تھا۔۔۔ پاکستان اس لحاظ سے ایک منفرد ملک ہے کہ اس کے دو حصّے ہیں جو برابر کے اہم ہیں اور ان کے درمیان ایک ہزار میل چوڑا غیر ملکی علاقہ حائل ہے۔ آزادی کے وقت کل آبادی سات کروڑ چالیس لاکھ تھی۔"(۳)

۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۹ء تک فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان کے فوجی اقتدار کے باعث ملک جمہوری روایات سے محروم رہا۔ ملک کے مسائل حل ہونے کے بجائے بڑھنے لگے۔ بالخصوص ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ سے پاکستان کو معاشی حوالے سے ایک بڑا دھچکا لگا۔ اس سے ملک کی معیشت کمزور ہو گئی۔ ان حالات میں ملک کے مسائل حل ہونے کے بجائے بگاڑ کا شکار ہو گئے۔ سردار شوکت علی لکھتے ہیں:

"اکتوبر ۱۹۵۸ء کو یعنی ایوب خان کے مارشل لا لگانے سے ایک دن پہلے پاکستانی فوج قلات میں داخل ہو گئی۔ اور اس طرح ایوب خان کے مارشل لا لگانے کا جواز مہیا کر دیا۔ فوج نے قلات اور اس عملہ کو گرفتار کر لیا۔ اور ان کے علاوہ تین اور سیاسی رہنماؤں کو بھی حراست میں لے لیا۔"(۴)

جنرل محمد ایوب خان نے ملک میں دس سال سے زیادہ حکومت کی۔ ان کے دور حکومت میں سخت پالیسیاں بنائی گئیں جس سے ملک کے لوگوں کو سنگین صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص کر مشرقی پاکستان میں بے

روزگاری، مہنگائی، افراتفری، انتشار اور مایوسی کی فضا نے جنم لیا۔ اس سے لوگ مایوس ہونے لگے۔ وہ مغربی پاکستان کے حکمرانوں اور افواج پاکستان سے نفرت کرنے لگے۔ مشرقی پاکستان کے لوگ اس ساری صورتحال کی وجہ سے بدحالی اور پسماندگی کا شکار ہوئے۔ ان کی معاشی صورتحال خراب ہو رہی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کی معاشی صورتحال کو بہتر بنانے کے لیے حکمرانوں نے بہتر کام نہیں کیا۔ اس بنیاد پر مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں مغربی پاکستان کے حکمرانوں کے خلاف نفرت بڑھنے لگی۔ ارشد محمود آصف لکھتے ہیں:

> "عوامی دباؤ کے پیش نظر ایوب خان نے صدارت سے استعفٰی دے دیا۔ آئین منسوخ کر دیا گیا۔ ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور حکومت یحییٰ خان کے حوالے کر دی گئی یحییٰ خان نے اپنی مضبوط پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ون یونٹ توڑنے کا فیصلہ کیا۔"(۵)

۱۹۶۹ء میں جنرل یحییٰ خان نے جب اقتدار سنبھالا تو وہ بھی حکومت کی بھاگ دوڑ کو بطریق احسن سنبھالنے میں ناکام رہے۔ اس سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لوگوں پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوئے۔ بالخصوص مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لوگوں میں مایوسی پیدا ہو گئی۔

۱۹۷۰ء میں ملک بھر میں عام انتخابات کا انعقاد کیا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ اور ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی جیسی بڑی جماعتوں نے الیکشن میں حصّہ لیا۔ مشرقی پاکستان میں ۹۸ فیصد نشستوں پر شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ جبکہ مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی زیرِ قیادت پاکستان پیپلز پارٹی نے واضح اکثریت حاصل کر لی۔ کرنل سید مقبول حسین لکھتے ہیں:

> "۷۰ء کے الیکشن شیخ مجیب الرحمٰن کو مشرقی پاکستان حصّے اور مسٹر بھٹو کو مغربی حصّے کے لیڈر کے طور پر سامنے لے آئے۔ چونکہ مشرقی پاکستان کے عوام کی اکثریت تھی لہذا عوامی لیگ کو حکومت بنانے کی اجازت ملنی چاہیئے تھی۔"(۶)

اس نازک صورت حال میں مرکزی حکومت بنانے کے لیے ایک بدترین کشمکش پیدا ہو گئی۔ دونوں بڑی جماعتیں مرکزی حکومت بنانا چاہتی تھیں۔ دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے مابین پرامن تصفیہ نہ ہونے

کے باعث ملک سیاسی طور افراتفری کا شکار ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کے عوام میں ان اختلافات کے باعث نفرت پیدا ہو گئی۔ جنرل یحیی خان بھی چاہتے تھے کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں رہے۔ صدیق سالک لکھتے ہے:

"عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں ۱۶۴ میں سے ۱۴۰ نشستیں جیت کر زبردست معرکہ مارا، مگر مغربی پاکستان میں ایک سیٹ بھی حاصل نہ کر سکی۔ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں ۱۳۸ میں سے ۸۱ نشستیں جیت کر پورے مغربی بازو میں اکثریت حاصل کر لی۔ مشرقی بازو میں امیدوار بھی کھڑا نہ کر سکی۔ اس سے ایک دلچسپ مگر نازک صورت حال پیدا ہو گئی۔"(۷)

الغرض ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ملک سیاسی ابتری کا شکار ہو گیا۔ خاص کر بنگال کی اکثریتی آبادی پر مغربی پاکستان کے افسروں کی تعیناتی اور قومی زبان کے طور پر اردو کی منظوری، ملازمتوں میں بنگالیوں کا کم حصّہ اور دیگر ملک کے اندورنی مسائل کی وجہ سے مشرقی پاکستان کا مسئلہ گھمبیر تر ہوتا چلا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی جماعت کی خواہش تھی کہ وہ متحدہ پاکستان میں مرکزی حکومت بنائیں لیکن جب وہ اس مقصد کے حصول میں ناکام رہے تو انھوں نے تحریکِ عدم تعاون چلانے کا اعلان کیا۔ اس تحریک کی آڑ میں نادیدہ دشمنوں نے ہنگامے برپا کرنا شروع کر دیئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے پر امن سیاسی تصفیے کے لیے چھ نکات پیش کیے۔ تاہم ذوالفقار علی بھٹو نے ان سے اتفاق نہ کیا۔ محمد اصغر خان لکھتے ہیں:

"مشرقی پاکستان کے مطالبات ایک واضح اور سخت انداز میں شیخ مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ کے چھ نکات کی صورت میں پیش کیے جا چکے تھے۔ یہ چھ نکات جنوری ۱۹۶۶ء میں معاہدہ تاشقند کے فوراً بعد اپوزیشن لیڈروں کے ایک اجلاس میں پیش کیے گئے۔ یہ نکات پیش کرنے کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن کو پہلے سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔"(۸)

بڑھتی ہوئی لاقانونیت اور بیرونی مداخلت کو روکنے کی غرض سے ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو جنرل ٹکا خان کی سربراہی میں (سرچ لائٹ) کے نام سے فوجی آپریشن شروع ہوا۔ ان اقدامات کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے لوگ مغربی پاکستان اور اس کی برسرِ اقتدار قیادت سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگے۔

صدیق سالک لکھتے ہیں:

"جتنی نفری آتی گئی اسے آپریشن سرچ لائٹ کی تکمیل پر لگا دیا گیا۔ یہ آپریشن جو ۲۵ مارچ کی رات کو شروع ہوا اس کے باضابطہ اختتام کا کبھی اعلان نہیں کیا گیا۔۔۔ عقل دانش نے ۲۶ مارچ کو مشرقی پاکستان سے نکال دینے کا حکم دیا تھا ان میں سے اکثر کلکتہ جا کر بیٹھے "(۹)

۱۵ فروری ۱۹۷۱ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا۔ قومی اسمبلی میں شرکت کی یقین دہانی کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو نے شرکت سے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے یحیی خان نے یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو غیر معینہ مدت تک قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا۔ قومی اسمبلی اجلاس کے التوا کی بدولت ۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب الرحمٰن کی کال پر ملک گیر ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ محمد عاصم بٹ رقمطراز ہیں:

"عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن نے ۲۵ مارچ کو منعقد ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور اس ضمن میں چار شرائط پیش کر دیں "(۱۰)

۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب الرحمٰن نے سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان کر کے ملک کے اندر انتشار پھیلا دیا۔ ملک میں حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ لوگوں کے دلوں میں مغربی پاکستان، افواج پاکستان اور مغربی پاکستان کے حکمرانوں کے خلاف نفرت بڑھ گئی۔ لوگوں کے دلوں میں غم اور غصہ کو ہوا دی گئی اور جگہ جگہ پاکستانی پرچم نذرِ آتش کیے گئے۔ ۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب الرحمٰن نے باقاعدہ طور پر حکومت بنانے کا اعلان کر دیا۔ پاکستانی جھنڈے کے بجائے بنگلہ دیش کے جھنڈے لہرائے گئے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو بنگلہ دیش کا جھنڈا شیخ مجیب الرحمٰن کی رہائش گاہ سیکرٹریٹ اور دیگر اہم عمارتوں پر باقاعدہ لہرا دیا گیا۔ کرنل سید مقبول حسین رقمطراز ہیں:

"مسٹر بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن دونوں مکمل طور پر مجموعی پاکستان کی سطح پر اپنے آپ کو نہ منوا سکے۔ اس طرح پاکستان کی تقدیر کی کشتی دو ملاحوں میں بٹ گئی۔ وزن پھر بھی فوجی قوت تھا جس کا استعمال کرنے پر بالآخر ۱۹۷۱ء کی جنگ اور پھر یحیی خان سے اقتدار

کی منتقلی مسٹر بھٹو تک اور ۱۹۷۱ء میں پاکستان کا دولخت ہو جانا قوم کی ذلت کے بدترین مقامات ہیں۔"(۱۱)

عوام کے اندر بھی غم اور غصہ تھا۔ اس سے ملک دشمن عناصر نے پھر پور فائدہ اٹھایا۔ وہ مشرقی پاکستان کے لوگوں میں افواجِ پاکستان اور حکمرانوں کے خلاف نفرت انگیز آگ بھڑکانے میں کامیاب ہو گئے۔ جس سے صوبوں میں فاصلے مزید بڑھ گئے۔ جنرل کے ایم عارف رقمطراز ہیں:

"مارچ ۱۹۷۱ء میں شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان لایا گیا تھا اور انھیں فیصل آباد کی جیل میں رکھا گیا تھا۔ ان پر فیلڈ جنرل کورٹ مارشل میں جس کی صدارت بریگیڈیر رحیم الدین نے کی تھی مقدمہ چلایا گیا۔ ان پر جو الزمات لگائے تھے ان میں بغاوت کا الزام بھی تھا۔۔۔ شیخ مجیب الرحمن کو میانوالی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔"(۱۲)

۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو یحیٰی خان نے قوم سے خطاب کیا۔ اس خطاب کے دوران انھوں نے عوامی لیگ پر پابندی لگانے کا اعلان کیا۔ سارے حالات کا قصوروار شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں کو ٹھہرایا گیا۔ اوران کو سزا دینے اور ملک دشمن عناصر کا ساتھ دینے کا ذمہ دار ٹھہرا دیا گیا۔ اس اعلان کی بدولت شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کی عالمی سطح پر مذمت کی گئی اور ملک دشمن عناصر نے مزید ہوا دی۔ صدیق سالک لکھتے ہے:

۲۳ مارچ کو عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنا دستوری مسودہ پیش کیا انھوں نے اپنے بیان میں کہا کہ اگر حکومت نے ان کے مطالبات کو تسلیم نہ کیا تو عوامی لیگ اپنے مہم کو تیز کر دے گئی۔"(۱۳)

عالمی ذرائع ابلاغ نے مشرقی پاکستان میں نفرت انگیز تعصب کو مزید ابھارا۔ اس طرح حالات دن بدن ابتر ہونے لگے۔ مشرقی پاکستان میں مارشل لاء ایڈ منسٹر جنرل ٹکاخان نے کرفیو لگا کر مشرقی پاکستان کے حالات کو کافی حد تک کنٹرول کر لیا۔ چند عسکریت پسندوں نے فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اس سے مشرقی پاکستان میں باغیوں کے خلاف آپریشن آسان ہو گیا تھا۔ یہ آپریشن کافی حد تک کامیاب ہوا اور اس سے مکتی باہنی کے غنڈوں کو بری طرح شکست ہوئی۔ تاہم اس آپریشن کو ملک دشمن عناصر نے غلط رنگ دیا اور یہ تعصب دینے کی

کوشش کی جیسے ملک دشمن قوم نے حملہ کر دیا ہو۔ اس سے حالات سنبھالنے کے بجائے بگڑ گئے۔

صدیق سالک لکھتے ہیں:

"جنرل ٹکا خان کی تبدیلی اور دوسرے باغیوں کے لیے عام معافی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ پہلا اقدام انہوں نے بعض ملکی اور غیر ملکی خیر خواہوں کے اصرار پر اٹھایا تھا کیوں کہ ان کے خیال میں جب تک مشرقی پاکستان کی بھاگ دوڑ ٹکا خان کے ہاتھوں میں ہے وہاں حالات سدھار نہیں سکتے۔"(۱۴)

بھارت نے مشرقی پاکستان میں ملک پاکستان کو دولخت کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خاص کر جب ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے بنگلہ دیش کا پرچم اپنی رہائش گاہ پر لہرایا اس کے بدلے میں ان کو گرفتار کر لیا تو بھارت نے مشرقی پاکستان کے اندر افراتفری، غم و غصہ اور نفرت کی فضا کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ توصیف احمد خان لکھتے ہیں:

"مشرقی پاکستان میں گھر گھر بنگلہ دیش کے پرچم لہرا رہے تھے۔ اس کے حق میں نعرے لگائے جا رہے تھے۔ مغربی پاکستان اور فوج کے خلاف دشنام طرازی کی جا رہی تھی۔۔۔ غیر بنگالی لڑکیوں کو اکثر مقامات پر اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔"(۱۵)

عوامی لیگ اور ان کی قیادت کی بھرپور مدد کی گئی۔ مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کے لوگوں سے مل کر پاکستانی فوجیوں اور اہم شہریوں کو قتل کروایا گیا جس سے خوف اور ڈر کی فضا پیدا ہو گئی۔ لوگ تذبذب کا شکار ہو گئے۔ لوگوں کے اندر مایوسی اور افسردگی پیدا ہو گئی۔ ان حالات کی بدولت مشرقی پاکستان کے ہزاروں لوگوں نے ڈر کر بھارت کی طرف نقل مکانی شروع کر دی۔ بھارتی حکومت نے ان مہاجرین کو پناہ دی اور اس بہانے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا صدیق سالک لکھتے ہے:

"جب ہم خانہ جنگی میں مصروف تھے تو بھارت مسلسل تینوں محاذوں پر بھرپور کام کر رہا تھا۔ اس کی مسلح افواج کے سربراہ جلد جلد اپنی جنگی مشینری کو صیقل کرنے لے گئے۔۔۔ ان تیاریوں کے ساتھ ساتھ بھارت نے پاک فوج کی جنگی صلاحیتوں کو کند کرنے کے لئے مکتی باہنی کو منظم کیا۔ مکتی باہنی کی ریڑھ کی ہڈی سابق ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے باغی افسر اور سپاہی تھے۔"(۱۶)

مشرقی پاکستان کی حفاظت کے لئے کوئی بھی موثر اقدام نہ اٹھایا جاسکا۔ بھارتی افواج کی جارحیت کے باعث دونوں ملکوں کے درمیان فضائی رابطہ منقطع ہو گیا جس کے باعث ملک کے دونوں حصّوں کے درمیان زمینی فاصلہ بھی بہت زیادہ تھا۔ دشمن قوتوں کی نفرت انگیز پراپیگنڈہ مہم کا شکار ہو کر مقامی لوگ بھی پاکستانی فوج کا ساتھ دینے سے انکار کرنے لگے اور بھارتی فوجیوں کے خلاف کوئی مزاحمت نہ کی۔ ملک کے اندر حالات اس قدر کشیدہ اور خوف زدہ ہو گئے کہ پاکستانی فوج اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگی۔ آخر پاکستانی فوج کو بھارتی افواج کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ بھارت یہ جنگ جیت کر پاکستان کو دولخت کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اپنے مقاصد حاصل کر لیے۔ بھارت کی اس سازش کے نتیجے میں ہمارا دائیاں بازو ہم سے جُدا ہو گیا۔ اندرونی اور بیرونی سازشوں نے پاکستان کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بنگلہ دیش کے نام سے ایک نیا ملک معرضِ وجود میں آیا۔ صفدر محمود لکھتے ہیں:

> "بنگلہ دیش اور پاکستان کے عوامی سیاسی مزاج، سماجی ڈھانچے، عوامی شعور، قیادت اور فوج کے مفادات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہم نے علیحدگی حاصل کر کے مارشل لاء سے نجات حاصل کر لی لیکن پاکستان ایک نہ ایک دن پھر فوجی تسلط کا شکار ہو گا۔۔۔ بنگلہ دیش میں مظاہروں نے سیاسی بحران کی شکل اختیار کر لی جن میں بنیادی ایشو صاف شفاف انتخابات کا انعقاد تھا۔۔۔ معاشی نقصان اور سیاسی عدم استحکام کے حوالے سے ٹیک اور کا جواز بھی موجود تھا"(۱۷)

نااہل حکمرانوں کے سیاسی اختلافات، اقتدار کی ہوس، منفی تاثرات وغیرہ ایسی برائیاں تھیں جس سے ہمارا دائیاں بازو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔

ج: اردو افسانے میں سقوط ڈھاکہ: پس منظری مطالعہ

سقوط ڈھاکہ پاکستانی تاریخ کا اہم ترین اور ناقابلِ فراموش سانحہ ہے۔ اس واقعہ نے جہاں ایک طرف مغربی پاکستان کے عوام کو متاثر کیا وہیں ادیبوں اور دانش وروں پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے اندر سقوط ڈھاکہ کے سانحے کو موضوع بنایا ہے۔ اس واقعہ کا اثر اردو ادب پر بھی

براہ راست پڑا۔ بہت سے لکھاری اور ادیب ایسے تھے جو خود ہجرت سے دوچار ہوئے۔ پہلی ہجرت ۱۹۴۷ء میں کی جب کہ دوسری ہجرت سقوط ڈھاکہ کے وقت کی۔ ان ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے سقوط ڈھاکہ کے دوران خون میں ڈوبے ہوئے حالات اور وحشت بھرے واقعات کو موضوعِ سخن بنایا۔ سقوط ڈھاکہ کے واقعے نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کی یاد ایک بار پھر تازہ کر دی۔ سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں:

> "بنگلہ دیش بننے سے قبل مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان منتقل ہو جانے والے بہاری مسلمان ادیبوں نے بطور خاص اس سانحے پر قلم اٹھایا جو اس کشمکش، بغاوت، تصادم نفرت اور بد اعتمادی کو واضح کرتا تھا جو مشرقی پاکستان کے عوام کے دل و دماغ میں زہر بن کر پھیل رہی تھی"(۱۸)

اس پس منظر میں جہاں ان افسانوں میں دیگر موضوعات کی عکاسی کی گئی وہاں ہجرت کا المیہ، دکھ، کرب بھی اپنی پوری سنگینیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ شاعر اور ادیب کسی بھی معاشرے کے حساس ترین افراد ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کی نسبت ادیبوں اور شاعروں پر حالات براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کی تحریریں بھی حالات و واقعات کی صورت حال کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں پر خارجی پہلوؤں کے ساتھ داخلی حوالے سے بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ داخلی پہلوؤں سے عمومی طور پر معاشرے کے عام افراد ناواقف ہوتے ہیں۔ جب کہ ادیب باشعور ذہن کے مالک ہونے کے باعث معاشرے کے نباض بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ شہزاد منظر اسی حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ادیب معاشرے کا انتہائی حساس فرد ہونے کی وجہ سے اپنے دور کے سماجی امور کے بارے میں دوسروں سے زیادہ ادارک رکھتا ہے اور اپنے دور کے بارے میں سوچتا اور محسوس کرتا ہے، اسی لیے ہر دور اور معاشرے میں ادیب ایک ذمہ دار اور محب وطن شہری کی حیثیت سے اپنے دور کے سماجی اور سیاسی معاملات کے بارے اپنا مخصوص نظریہ اور موقف رکھتا ہے۔" (۱۹)

اردو افسانوں میں سقوط ڈھاکہ کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستانی ادب میں سقوط ڈھاکہ کو ایک المیے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ اس سانحہ

کے واقعات کو ادیبوں اورافسانہ نگاروں نے اپنے جذبات اوراحساسات کے ساتھ اپنی تحریروں میں برتا ہے۔انتظار حسین، مسعود مفتی،انور سجاد،نشاط فاطمہ،الطاف فاطمہ،رضیہ فصیح احمد جیسی افسانہ نگاروں نے ان موضوعات کو احاطہ تحریر میں لایاہے۔اس سلسلے میں آغا سہیل کے افسانہ "پرچم"اور غلام محمد کے افسانہ "ایک سما ہوا شخص"ابتدائی دور کی نمایاں مثالیں ہیں۔نومبر ۱۹۷۰ءکے رسالے "فنون"میں یہ افسانے شائع ہوئے۔کچھ ادیب اور شعراءایسے بھی تھے جو مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان آباد ہو گئے۔ان ادیبوں نے بنگالیوں کی نفرت اور حقارت کا مشاہدہ براہ راست کیا۔ بعض ادیب ایسے بھی تھے جو ان کی نفرت اور حقارت کا شکار بھی ہوئے۔ مذکورہ موضوع پر لکھنے والوں نے اس سانحے کا نہ صرف براہ راست مشاہدہ کیابلکہ ذاتی طور پر بھی اپنے مشاہدات ، جذبات اور حالات وواقعات کو قاری کے سامنے افسانے کی صورت میں پیش کیا۔ شمائل ریاض رقمطراز ہیں:

> "پاکستان کی تاریخ کو دیکھا جائے تو یہ ابتدا ہی سے دو حصّوں میں منقسم رہی۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے نام سے دو حصّوں(جغرافیائی طور پر الگ تھے) کے درمیان کا وجود تھا۔دونوں ناموں میں پاکستان کا لفظ تو موجود ہے مگر اس کے ساتھ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان لفظ غیر محسوس انداز میں ملک کی تقسیم شروع کر دی تھی۔۔۔اور بلا آخر مشرقی پاکستان بنگلہ دیش جبکہ مغربی پاکستان صرف پاکستان کے نام سے موسوم ہوا"(۲۰)

قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کا یہی خیال تھا کہ اب ان کے حالات بہتر ہو جائیں گئے اور تمام تر مسائل بھی حل ہو کر ایک خوشگوار زندگی بسر کرنے کا موقع ملے گا۔ لیکن سقوط ڈھاکہ کے واقعے نے ان کے خوابوں کو چکناچور کر دیا۔ابراہیم جلیس کے افسانوی مجموعے "زرد چہرے"،"چالیس کروڑ بیکاری"، "کچھ غم جانہ" اور "کالا چور"ہیں۔ابرہیم جلیس کا افسانہ "بانگلہ دیش"سقوط ڈھاکہ کے حالات واقعات پر مبنی افسانہ ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار ایک بچہ "ندرل"جو غریب خاندان سے تعلق رکھتاہے۔ اور اپنا قرض اتارنے کے لیے کراچی میں دن رات مزدوری کرتاہے۔"ندرل"بنگلہ دیش کے قیام سے افسردہ ہے۔ایسی سوچ بچار میں مبتلا رہتا ہے کہ غریب کی کوئی جگہ اور پناہ گاہ نہیں ہے۔وہ یہی سوچتاہے کہ بنگلہ دیش کے قیام سے ایک الگ ملک تو بن

گیا ہے۔ مگر غریبوں کا ایک الگ ملک نہیں بنا۔ جہاں وہ اپنی مرضی سے خوشحال زندگی بسر کر سکے۔

اقتباس ملاحظہ ہو:

"میرا بنگلہ دیش ابھی کہاں بنا۔ پتہ نہیں ہم غریبوں کا بنگلہ دیش کب بنے گا صاحب۔۔۔ ابھی تو بڑا بنگلہ والا بنگالیوں کا دیش بنا ہے۔ شیخ مجیب کا بنگلہ دیش، نور والا میں چودھری کا بنگلہ دیش۔۔۔ ندرل کا بنگلہ دیش کدھر ہے۔"(۲۱)

معاشی مسائل نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی یکجہتی کو ختم کر کے رکھ دیا۔ ان واقعات کی عکاسی "رضیہ فصیح احمد" نے بڑی عمدہ طریقے سے کی ہے۔ وہ بذاتِ خود بھی ہجرت کے المیے سے دوچار ہوئی تھیں۔ ان کا افسانہ "پل" سقوط ڈھاکہ کے واقعہ پر ایک شاہکار افسانہ ہے۔ "پل" کو بطور علامت مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے باہمی تعلق کے بیان کے طور پر پیش کیا گیا ہے ہے۔ جس طرح ایک پل دو حصّوں میں ٹکرے ٹکرے ہو جاتا ہے اسی طرح مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی حالت بھی خستہ حال پل کی طرح ہو گئی۔ اس پل کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہے:

"اور وہ آدھا پل، خستہ خراب، زنگ آلود کیلوں، سیمنٹ کے بجائے ریت کے ڈھیروں پر ٹھہرا ہوا کھڑا تھا۔ اس پر تازہ شفق رنگ، لہو کا رنگ ڈوبتے سورج کی روشنی میں دریا پر اپنا عکس ڈال رہا تھا اور پل پر چلنے والے سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ ان کے نیچے دریا ہے، پل ٹوٹا ہوا ہے، باہر دشمن کی ناکہ بندی ہے، اب کیا ہو گا! اب کیا ہو گا! آدھا پل ان سے چھین گیا، ان کے بھائی بند قتل ہو گئے یا قید ہو گئے اور پل کے نیچے زمین نہیں ہے۔ سب کا جی چاہ رہا تھا کہ اس دریا میں کود جائیں اور ڈوب جائیں۔"(۲۲)

سقوط ڈھاکہ کے سانحہ کو "انتظار حسین" اپنے افسانوں میں اجتماعی دکھ کی صورت میں پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا افسانہ "شہر افسوس" سقوط ڈھاکہ پر مشتمل ایک شاہکار افسانہ ہے۔ علامتوں اور استعاروں کا سہارا لے کر واقعات کو مخصوص انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ انتظار حسین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"برصغیر کے مسلمانوں کو زوال ڈھاکہ کے ساتھ دوسری ہجرت کا سامنا کرنا پڑا، تب انتظار حسین نے اس تسلسل میں پورا اترتے ہوئے اپنے کئی پرانے افسانوں کو "شہر

افسوس" میں یکجا کیا اور انھیں نئے معانی سے دو چار کر دیا۔ ہجرت کے حوالے سے
انتظار حسین کے ہاں خاص طرح کی ٹیشن جاری ساری ہے۔"(۲۳)

سیاسی اور سماجی انتشار نے پاکستانی معاشرے کو سقوط ڈھاکہ کے سانحہ سے دو چار کیا۔ سقوط ڈھاکہ کے دوران ہجرت کرنے والے اور شناخت سے خالی لوگوں کا دکھ بھی "انتظار حسین" اپنے افسانوں میں بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے بھوک، افلاس، تنگ دستی، بے حرمتی جیسے مسائل کی روداد کی عکاسی بھی اپنے افسانوں کے اندر عمدہ طریقے سے کی ہے۔ "شہر افسوس" میں انتظار حسین نے ڈھاکہ شہر کی خراب صورتحال کو اجاگر کیا ہے، جہاں زندہ انسان بھی خود کو مردہ تصور کرتے ہوئے زندگی کے نشان سے بھی گمشدہ ہیں۔ ڈھاکہ کے حوالے سے انتظار حسین نے اپنے افسانے کے اندر اس انداز سے عکاسی کی ہے۔

"اسی طرح بھاگتے بھاگتے ایک نرالے نگر میں جانکلا، لاشیں دور دور تک نظر آرہی
تھیں۔ جتنا آدمی کہیں آس پاس نظر نہ آیا۔ میں حیران وپریشان ایک کوچے سے
دوسرے کوچے میں ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں گیا۔ بازار بند، راستے
سنسان، گلیاں ویران، کہیں کہیں مکان کے بالائی دریچے کے پٹ اتنے کھلتے کہ وہ سہمی
سہمی آنکھیں نظر آتیں اور پٹ جلدی سے بند ہو جاتے۔ عقل حیران تھی کہ کیسا نگر
ہے۔ لوگ گھروں میں مقید بیٹھے ہیں۔"(۲۴)

سقوط ڈھاکہ کی وجوہات کو بیان کرتے ہوئے "انتظار حسین" نے لسانی اور تہذیبی مسئلے کی بھی عکاسی کی ہے۔ ان کا افسانہ "اندھی گلی" مشرقی پاکستان سے ہجرت کرنے والے بے بس اور مجبور لوگوں کی داستان ہے۔ ڈر، خوف، حرص میں مبتلا لوگ مغربی پاکستان میں پناہ گاہ لینا چاہ رہے تھے لیکن ہجرت کرنا اور کہیں پناہ لینا آسان نہیں تھا۔ افسانے کے کردار کے ذریعے ہجرت کے دوران درپیش مسائل کی عکاسی یوں کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"نکل آئے ہو نکل چلو، آگے جانے کی نسبت واپس جانے میں زیادہ خطرہ ہے۔"(۲۵)

علی حیدر نے بطور افسانہ نگار سقوط ڈھاکہ کے المیے کے شکار لوگوں کی عکاسی اپنے افسانے "پسپائی کے آخری موڑ" میں کی ہے۔ علی حیدر نے اپنے افسانے کے اندر سقوط ڈھاکہ کے بعد کے حالات کی عکاسی کی

ہے۔ مقامی لوگوں نے نئی زندگی کے آغاز کو قبول نہیں کیا۔ تنگ کر کے ایسے افراد کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ارے یہ یہاں کیوں سویا ہوا ہے ہمارے محل پر قبضہ کرے گا کیا؟ سانولے رنگ کے ایک دبلے پتلے آدمی نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ نکالو، نکالو، اسے یہاں سے نکالو بہت سی آوازیں کھلے خنجر کی طرح فضا میں لہرانے لگیں۔"(۲۶)

سقوط ڈھاکہ کے سانحہ کی وجہ سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی عوام تذبذب کا شکار ہو گئی۔ وسوسوں اور اندیشوں میں گھیرے ہوئے لوگ ہجرت سے جب دوچار ہوئے تو ان کی زندگیوں کا دائرہ تنگ ہونے لگا۔ ایسی صورتحال کی عکاسی اختر جمال کے افسانے "دوسری ہجرت" میں باکمال انداز میں کی گئی ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھا گیا یہ افسانہ دکھ اور کرب سے دوچار خاندان کا شاندار عکاس ہے۔

افسانہ "دوسری ہجرت" ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے جو کلکتہ سے ہجرت کر کے قیام پاکستان کے بعد ڈھاکہ میں رہائش اختیار کرتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار "منشی سرفراز حسین" ہے جنہیں ہمیشہ سے ہی ڈھاکہ عزیز تھا۔ اپنے بچوں کے ساتھ جانے والا افسانے کا مرکزی کردار سب کو بسم اللہ پڑھ کر نئی زمین میں قدم رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن جلد ہی یہ ڈھاکہ بھی بنگالی اور غیر بنگالی کی لسانی کشمکش کا شکار ہو گیا۔ بنگالی اور غیر بنگالی تقسیم اور اندیشوں میں گھیرے اس خاندان کے ذہنوں کے اندر کئی طرح کے سوالات نے سر اٹھایا کہ ان کا آخر کون ساٹھکانہ ہے۔ بے بس اور مجبور خاندان نے زندگی کا دائرہ تنگ ہونے کی وجہ سے ایک بار پھر ہجرت کا فیصلہ کیا۔ اس خاندان کی ذہنی و قلبی کیفیت کو "اختر جمال" نے افسانے کے اندر یوں بیان کی ہے:

> "صدمے نقاہت اور ضعف سے منشی سرفراز حسین کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ سب ہوائی جہاز میں بیٹھ گئے۔ منشی سرفراز حسین کی بوڑھی آنکھیں حدائق تک دیکھتی رہیں۔"(۲۷)

سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے افسانہ "پس دیوار زنداں" ہے۔ اس میں "اختر جمال" نے ہجرت کے دکھ کی عکاسی مختلف زاویوں سے کی ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ حالات واقعات انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے ہیں۔ جب سقوط ڈھاکہ پیش آیا تو حالات کے دھارے میں بہتے ہوئے انسان ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ اسی

طرح "زرد پتوں کا بن" افسانہ میں ۱۹۷۱ء کے فسادات اور ہجرت کے بعد انسان کی اداسی کو پیش کیا گیا ہے۔

بیشتر افسانہ نگاروں کے ہاں سقوط ڈھاکہ ایک اہم موضوع رہا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے واقعہ کے دوران لوگوں کی ذہنی کیفیت اور ذہنی کشمکش کو جن بیشتر افسانہ نگاروں نے بیان کیا ہے ان میں ایک نام "مسعود اشعر" کا بھی ہے جنھوں نے اپنی زندگی کی پہلی ہجرت ۱۹۵۱ء میں کی اور پاکستان میں آکر آباد ہوئے۔ دوسرا واقعہ ان کی زندگی میں سقوط ڈھاکہ کے طور میں پیش کیا۔ اسی واقعہ کو اپنے پہلے افسانوی مجموعے "آنکھوں پر دونوں ہاتھ" میں پیش کیا۔ ان کی یہ تمام کہانیاں سقوط ڈھاکہ کے پس منظر پر مشتمل ہے۔ افسانوں میں "دکھ جو مٹی نے دیے، "آنکھوں پر دونوں ہاتھ"، "اپنی اپنی سچائیاں" وغیرہ اہم ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے سانحہ کو موضوع بنانے والوں میں "مسعود اشعر" کا بھی اہم نام ہے وہ سماجی شعور کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ فرد کی داخلی شکست و ریخت اور تنہائی کا احساس بھی رکھتے تھے۔ "دکھ جو مٹی نے دیے" مسعود اشعر کا علامتی افسانہ ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار "میں" کے ذریعے مسعود اشعر نے ایسے لوگوں کے جذبات کی عکاسی کی ہے جو نہ صرف اپنی ماؤں کی گود سے محروم ہوئے بلکہ دوسروں نے بھی انھیں قبول نہیں کیا۔ افسانے کا مرکزی کردار "میں" کو ایک لڑکی کا گانا بہت پسند آتا ہے۔ لیکن اسے اس لیے منع کر دیا جاتا ہے کہ وہ اس کی تعریف نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا رنگ بنگال کے لوگوں سے الگ ہے۔ افسانے میں اقتباس ملاحظہ ہو:

> "وہ تمھیں اس لیے پسند آئی ہے کہ اس کا رنگ ہماری زمین کا رنگ نہیں ہے۔۔۔ اس کا رنگ اس زمین سے ملتا ہے، جو تمھارے دل و دماغ میں بسی ہوئی ہے۔۔۔ میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ یا وہ میرے دل و دماغ میں یہ بات ڈالنا چاہتے تھے نفسیاتی طور پر"(۲۸)

بہت سے افسانہ نگار ایسے تھے جنھوں نے سقوط ڈھاکہ کے وقت ہونے والے فسادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ روزمرہ حقائق اور انسانی نفسیات کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا ہے۔ ان ہی میں ایک نام "مسعود مفتی" کا بھی ہے۔ جن کا اصل نام "مسعود الرحمٰن" ہے۔ انھوں نے ملازمت کے سلسلے میں مختلف ملکوں اور شہروں میں قیام کیا۔ "مسعود مفتی" سقوط ڈھاکہ کے واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں۔ خارجی حالات کے تحت بدلنے والی انسانی نفسیات کی سچی تصویر کو اپنے افسانوں کے اندر اس انداز سے پیش کیا ہے کہ کوئی بھی

پہلوتشنہ نہیں رہتا۔"مسعود مفتی"نے سقوط ڈھاکہ کے پس منظراوراس وقت کے حالات کو قاری کے سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔حکومتی مشینری اس سانحہ کے مختلف پہلوؤں کو چھپاناچاہتی تھی۔لیکن ادیبوں نے حقائق سے پردہ اٹھانے کی ذمہ داری عمدہ اندازسے کی ہے۔سقوط ڈھاکہ پر مشتمل ان کاافسانوی مجموعہ "ریزے" ۱۹۷۴ءمیں منظرعام پر آیا۔یہ مجموعہ(۱۰)افسانوں پر مشتمل ہے۔"ریزے"میں مشتمل تمام افسانے سقوط ڈھاکہ کے واقعہ کے متعلق ہیں۔مسعود مفتی نے قاری کے سامنے اس وقت کے کشیدہ حالات کو سامنے لایا۔یہ بات بنگالیوں کے ذہن میں واضح طور پر پختہ ہوگئی تھی کہ اب انھیں پاکستان کے ساتھ نہیں رہنااور فوج بھی عوام کااعتماد حاصل کرنے میں ناکام ہوچکی تھی مسعود مفتی کے افسانہ "یادیں" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ماضی سے رشتہ ٹوٹ رہاتھاحال میں دراڑیں پڑ رہی تھیں اور بالکل مختلف مستقبل جھانک رہاتھا۔"(۲۹)

مسعود مفتی نے افسانے کے ذریعے ڈھاکہ کی فضاؤں میں کھچاؤاور تناؤ کی کیفیت عمدہ اندازسے بیان کی ہے۔یعنی ماضی کے حالات کی وجہ سے حال میں دراڑیں پڑرہی تھی۔اسی طرح مسعود مفتی کاافسانہ "باغی" بھی سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھاگیااور یہ شاہکار افسانہ ہے۔اس افسانے کے اندر مشرقی پاکستان کے حالات کا نقشہ بڑے عمدہ اندازمیں پیش کیاگیاہے۔لاقانونیت کی وجہ سے غیر بنگالیوں کے نا صرف گھر جلادیے گئے بلکہ قتل وغارت اور عورتوں کی عزتیں پامال کرنا ایک عام سی بات بن گئی تھی۔حالات پر قابوپانے کے لیے فوج کو طلب کیا گیا۔فوجی اقدام کے باعث بہت سے بے گناہ بنگالی قتل ہوگئے۔افسانہ "سپنا" کے اندر "مسعود مفتی" نے فوج کے اس رویے اوراس کاروائی کے ذریعے حالات کی کشیدگی کو عمدہ اندازمیں پیش کیاہے۔ افسانے کے اندر لکھتے ہیں:

> "پھر ۲۵مارچ آگیا۔رات کو پاکستانی فوج نے الیکشن شروع کیااور بعدازاں کئی دن پکڑ دھکڑ کاسلسلہ جاری رہا۔اس میں اس کا خاوند بھی پکڑا گیا۔پھر؟مفیظ نے دل چسپی سے پوچھا۔پھر اس کے کہ اسے پتاچلتا کہ اس کا خاوند پکڑا گیاہے اسے دوسرے مشتبہ لوگوں کے ساتھ گولی ماردی گئی۔"(۳۰)

یہ وقت تھا جب مغربی پاکستان کی حمایت کرنے والوں کو زندہ در گور کیا جارہا تھا۔ دوسری طرف بنگالیوں کے ساتھ ہاتھ ملانے پر پاکستانی فوج سے مارے جاتے۔ ایسی ہی کشمکش کی عکاسی "مسعود مفتی" نے اپنے افسانوی مجموعے کے اندر کی ہے کہ حالات دونوں طرف بہت خراب ہو چکے تھے۔ اپنے ہی ملک میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے پاکستان دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ اسی روایت میں ایک اہم نام "اے خیام" کا بھی ہے جنھوں نے سقوط ڈھاکہ کے سانحہ کو بہت قریب سے دیکھا۔ "اے خیام" کے افسانوں کے موضوعات اپنے ماحول سے ہی جنم لیتے ہیں۔ جب سقوط ڈھاکہ کا واقعہ پیش آیا تو اس بڑے سانحہ کو اپنی گرفت میں لے کر انسانوں کے دکھوں کی نسبت سے پیش کیا۔ سقوط ڈھاکہ کی وجہ سے انسانوں کے اندر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یہ تبدیلیاں رشتوں ناطوں کی ٹوٹ پھوٹ اور مٹی کے ساتھ نسبت کے سبب المیوں کی صورت میں رونما ہوئیں۔ ان کے افسانے "اجنبی چہرے" میں ایسے ہی حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اصل میں ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہم بڑے متوازن تھے۔ مگر اچانک کچھ طاقت ور ہاتھوں نے اندر پلڑوں کو ہلا دیا اور ہمارا توازن قائم نہ رہ سکا، ہم ایسے لکھڑائے کہ پھر سنبھل نہ سکے اور اس وقت خود کو یہاں موجود رہے ہیں۔"(۳۱)

درج بالا اقتباس کے ذریعے یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ "اے خیام" نے اپنے افسانوں کے اندر دردمند ماحول کی عکاسی کی ہے۔ اسی پس منظر میں "اے حمید" کا نام بھی ہے۔ وہ پاکستان کی تاریخ کے اس واقعے کے عینی شاہد ہیں۔ انہوں نے اس واقعے کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ واقعات اور حالات کو اپنی گرفت میں لے کر معاشرے کی اصل تاریخ کو تحریروں میں محفوظ کیا۔ وہ سقوط ڈھاکہ کے سانحہ سے پہلے قیام پاکستان اور ہجرت کے واقعات بھی دیکھ چکے تھے۔ جس کی وجہ سے ہجرت کا دکھ، احساسات، جذبات اور مفادات پرستوں کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا۔ اپنے افسانوں کے اندر اس ساری صورتحال کے ممکنہ ذمہ دار عناصر کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ سقوط ڈھاکہ کی پرچھائیاں ان کے افسانوں میں جابجا ملتی ہے۔ ان کے افسانہ "اب جاگتے رہنا ہے" میں ان کا موضوع مشرقی پاکستان کے خراب حالات کا نقشہ ہے۔ اپنے افسانے کے اندر مشرقی پاکستان کے حالات کا نقشہ ایسے کھینچا ہے کہ اس دور کے حالات و واقعات کی جیتی جاگتی تصویر قاری کے سامنے آجاتی ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

"مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات خراب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بھارت کے شر پسند مداخلت کار سرحدی گاؤں میں تخریبی کاروائیاں کر رہے تھے۔ وقت کے ساتھ حالات زیادہ خراب ہوتے گئے۔۔۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا اب میرے لیے مشرقی پاکستان جانا مشکل ہو گیا۔ والد صاحب چٹاگانک میں تھے۔ ان کے بارے میں جتنا سوچتا طبعیت اتنی ہی زیادہ پریشان ہو جاتی۔ جنگ کے ایک المیے پر ختم ہو گئی اور بے کار ٹھوکریں کھاتا اس شہر میں آ گیا یہاں جب تک بسے تھے ایک معمولی سرائے ہوٹل میں قیام کیا۔۔۔ لیکن جب کام نہ مل سکا پیسے ختم ہو گئے تو نوبت فاقوں تک جا پہنچی۔"(۳۲)

"اے حمید" نے اپنے افسانوں کے اندر مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات اور شر پسندوں کی مداخلت کو عمدہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس سانحہ سے انجان لوگوں پر جب یہ قیامت ٹوٹی تو ان کے پاس سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ بھی نہ رہی۔ وہ لوگ جو ایک خوشحال زندگی گزار رہے تھے ان کی زندگی اس سانحہ کی وجہ سے غربت کا شکار ہو گئی۔ افسانے کا مرکزی کردار جو صرف کام کے سلسلے میں بنگال سے نکلتا ہے لیکن ۱۹۷۱ء کے واقعہ کے بعد وہ دوبارہ اپنے گھر بھی نہیں جا سکتا۔ یعنی "اے حمید" نے اپنے افسانے کے اندر ایسے لوگوں کے جذبات اور احساسات کی عکاسی کی ہے جو اس سانحہ سے دوچار ہوئے۔

"انور عنایت اللہ" جن کا اصل نام "عنایت اللہ شریف" ہے، اردو کے معروف افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا خاص موضوع مشرقی پاکستان ہے۔ کیوں کہ سقوط ڈھاکہ سے پہلے ہی نسل پرستی کی گونج سنائی دی جانے لگی تھی۔ لوگوں میں بے وطینت کا احساس اجاگر ہونے لگا۔ اخلاقی اور تہذیبی بحران مشرقی پاکستان میں پیدا ہو گیا۔ مغربی پاکستان کے لوگوں کے لیے مشرقی پاکستان میں کوئی جگہ نہ رہی۔ آخر کار ہجرت کر کے کراچی منتقل ہو گئے۔ لیکن یہاں بھی آ کے ان کو خراب حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ "انور عنایت اللہ" نے اپنے افسانے "ستم در ستم" میں نسل پرستی کو ہوا دینے والے لوگوں کا چہرہ بے نقاب کیا۔ ان لوگوں کی وجہ سے مشرقی پاکستان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا۔ کیوں کہ نسل پرستی کی وجہ سے بنگلہ دیش کے لوگ پاکستانیوں کو اپنا حصّہ سمجھنے کو بھی تیار نہ تھے۔ ذہنوں کے اندر نفرتیں اس قدر بڑھ چکی تھی کہ بنگلہ دیش کے عوام یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ وہ کبھی پاکستان کا حصّہ رہے ہیں۔ اس کی عکاسی "انور عنایت اللہ نے افسانے کے اندر یوں کی

ہے کہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"دیدی۔۔۔دیدی۔۔۔قمر بھائی کہتا ہے، بنگلہ دیش کبھی پاکستان کا حصّہ تھا۔یہ غلط ہے نادیدی؟ بنگلہ دیش تو ہمیشہ سے آزاد تھا اور پاکستان اس کا حصّہ تھا۔اور غلام تو پاکستان تھا نہ دیدی؟۔۔۔انگریز کا اور بنگلہ دیش کا بھی۔۔۔بنگلہ دیش نے اسے الگ کر دیا تھا نا۔"(۳۳)

درج بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ "انور عنایت اللہ" نے اپنے افسانے کے اندر نسل پرستی کے شکار لوگوں کی عکاسی کی ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی علیحدگی کی وجہ نسل پرستی بھی ہے۔ نسل پرستی کے شکار افراد میں نفرت اس قدر پیدا ہو چکی تھی کہ وہ پاکستان کو اپنے ملک کا حصّہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ان کو ہمیشہ لگتا تھا کہ بنگلہ دیش آزاد اور پاکستان انگریزوں اور بنگلہ دیش کا غلام رہا ہے "انور عنایت اللہ" نے اپنے افسانے کے اندر نسل پرستی کی وجہ سے پیدا ہونے والے حالات کی عکاسی کی ہے۔ یہ افسانہ بھی نسل پرستی کی طرف اشارہ ہے کیوں کہ نسل پرستی کو ہوا دینے والوں نے اپنے ناپاک عزائم کی وجہ سے اس ملک کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔

سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے "آغا سہیل" کا نام بھی اہم ہے۔ان کے افسانوی مجموعوں میں، "بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے"، "شہر ناپرساں"، "تل برابر آسماں"، "اگن کنڈلی" اور "بوند بوند پانی" شامل ہے۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل پاک بھارت تعلقات میں جو خرابی آچکی تھی اس صورتحال کو انہوں نے اپنے افسانے "پان" میں موضوع بنایا۔اس افسانے میں سیاست دانوں کی مفاد پرستی اور لالچ نظر آتی ہے جس کی وجہ سے ملک پاکستان دو لخت ہوا۔ان کا ایک اور افسانہ "پرچم" میں بھی قیام پاکستان سے لے کر سقوط ڈھاکہ تک کے دنوں کی عکاسی نظر آتی ہے۔ان کا افسانہ "ٹھکانہ کہیں نہیں" ہجرت کے حوالے سے ایک اہم افسانہ ہے جس میں ایسے لوگوں کی کہانی نظر آتی ہے جو قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے مشرقی پاکستان پہنچے۔ایک بار پھر ۱۹۷۱ء میں اس سرزمین سے ہجرت کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔انہیں ایک بار پھر دکھ، درد اور اپنوں سے بچھڑنے جیسی کیفیت سے گزرنا پڑا۔وہ ایک بار پھر گھر سے بے گھر ہو گئے۔

"یہاں کہیں اس مہاجر کا بھی ٹھکانہ ہے جسے پاکستان کہتے ہیں۔ اگر مشرقی پاکستان میں پاکستان نہیں تو پھر مغرب میں کیا ہو گا۔۔۔ انکل آپ کے پاس کوئی ایسی دور بین نہیں ہے جس سے ڈھاکہ نظر آئے۔"(۳۴)

منشایاد کا شمار ایک ایسے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے اس حوالے سے یہ اپنی جداشناخت رکھتے ہیں جنھوں نے اپنے دور کے اندر عصری مسائل کو اجاگر کیا۔ ان کے افسانوی مجموعے میں "ماس اور مٹی"، "خلا اندر خلا"، "وقت سمندر"، "درخت آدمی"، "دور کی آواز" شامل ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے "بند مٹھی میں جگنو"، "دوپہر اور جگنو" ہیں۔ اس افسانے میں سقوط ڈھاکہ کے مناظر کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ایک پاکستانی کے خواب کی حالت میں دیکھا گیا ہے۔ وہ پاکستانی خواب میں جاگتا ہے۔ اور بے حد بھیانک مناظر اسے نظر آتے ہیں۔

"ان کھرچے ہوئے کاغذوں کو دیکھ کر اسے بلیک آؤٹ یاد آتا ہے، پھر اس کے کان میں سائرن کی آواز گونجتی ہے۔
خندن۔۔۔ دھماکہ۔۔۔ خون۔۔۔ لاشیں۔۔۔ دھواں اور گھپ اندھیرا۔۔۔
مگر یہ سب تو خواب تھا
بنگلہ دیش۔۔۔ مکتی باہنی
عجیب واہیات خواب تھا۔"(۳۵)

خواب کی حالت میں مختلف مناظر میں ایک مکتی باہنی کا بھی مناظر ہے۔ یہ مکتی باہنی کا منظر اس ذہین میں سوال پیدا کرتا ہے۔ کہ وہ اس تنظیم کے بارے میں تحقیق کریں کہ آیا کہ مکتی باہنی کیا ہے۔ کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے اور مکتی باہنی کا خیال کس طرح ذہین میں آتا ہے۔ مکتی باہنی کا منظر ایسا تھا کہ اسے اس بات کی تشویش ہو جاتی ہے کہ کہیں یہ خواب کے بجائے حقیقت تو نہیں ہے۔ کہیں واقع ہی پاکستان جنگ ہار تو نہیں گیا۔ وہ خوف میں مبتلا ہو گیا۔ اور خدا سے دعا کرنے لگتا ہے کہ اے اللہ یہ خواب ہی ہو اس کو حقیقت نہ بنانا۔

سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ایک اور اہم نام ام عمارہ کا بھی ہے جن کا شمار اردو ادب کی اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں عصری مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی ہیں۔ جہاں ان کے افسانوں میں

دیگر موضوعات ہیں۔ وہاں ان کے افسانوں میں سقوط ڈھاکہ کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کے مسائل کو بھی اجاگر کیا ہے اس دوران لوگوں کے ساتھ ہونے والے ظالمانہ سلوک سے بھی پردہ اٹھاتی ہے اور ان کے مسائل کو قاری کے سامنے لاتی ہیں۔ انھوں نے مشرقی پاکستان کے حالات و واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کے افسانے "بہ گناہ ہی بے گناہ"، "کس نے کس کو اپنایا"، امرلتا" اور "جب آنکھ کھلی" بے حد اہم ہے۔ ام عمارہ کا افسانہ "بہ گناہ ہی بے گناہی" ایک ایسا شکار افسانہ ہے جو سقوط ڈھاکہ کا سبب بننے والے میں سب سے اہم مسلے زبان کے مسلے سے جنم میں ہونے والے فساد کو بھی بیان کرتا ہے۔ کہ کس طرح زبان کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے۔ ام عمارہ نے مہاجرین کی ذہینی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے۔ جنھیں بہت جلد اس بات کا پتا لگ گیا تھا کہ یہ زمین ان کا مستقل مکسن نہیں ہے۔ اس زمین میں ان کے لیے سکھ اور سکون نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہجرت ہی ان کے اہل خانہ کے لیے مفید ثابت ہو گئی۔

> "پھر کیا ہوا ابا جب ہمیں یہیں رہنا ہے اور اسی مٹی میں مل جانا ہے پھر ہماری جڑیں اسی طرح مضبوط ہو سکتی ہیں۔ بڑے بھیا نے بات کاٹی۔ تم کہہ سکتے ہو بیٹے ورنہ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ اس مٹی کا پیوند بن جانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا اور پیوند پیوند رہے گا"(۳۶)

اس کے علاوہ سقوط ڈھاکہ حوالے ایک اور اہم نام پروفیسر محمود واجد کا ہے ان کا افسانہ "آدھا سفر" سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے اہم ہے۔ یہ افسانہ سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے انسانی رویوں کی داستان شامل ہے جس میں نفرت نے اپنی جگہ لے لی ہے۔ سقوط ڈھاکہ اصل وجہ نفرت تھی۔ اس نفرت نے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف مختلف حقارتوں سے بھر دیا ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر معروف افسانہ نگار تنقید نگار کے حوالے سے اہم نام ہے۔ ان کے افسانے "محاذ ۱۹۷۱ء"، "سب کہاں"، شہری بدری"، سمندر کی چوری" اس حوالے سے اہم ہیں۔ ایک اور نام فرخندہ لودھی کا بھی اہم نام ہے۔ ان کا افسانہ "برسات کی گرم ہوا" سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے اہم ہیں۔ اس کے علاوہ غلام محمد اردو کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں، انھوں نے سقوط ڈھاکہ کے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کے افسانے "نیند"، "منزل اپنی

اپنی"، "اداسی"، "ترک وفا"، "تین مسافر" اور "ایک سہما ہوا شخص" ہیں۔

د: نشاط فاطمہ: سوانحی و ادبی آثار

نشاط فاطمہ اردو ادب میں ایک اہم مقام و مرتبے کی حامل ہیں۔ وہ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کو لکھنو میں پیدا ہوئی۔ بچپن ہی سے سادگی، شگفتگی، خوش خلقی اور بے غرضی ان کی شخصیت کا حوالہ تھا۔ وہ ایک حساس دل اور پر عظمت شخصیت کی مالک تھیں۔ انہیں ایک علم دوست خاندان ورثے میں ملا۔ چنانچہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی کی سطح تک تعلیم حاصل کی اس حوالے سے ڈاکٹر زینت افشاں لکھتی ہیں:

> "اردو کی ناول نگار اور افسانہ نگار نشاط فاطمہ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کو لکھنو میں پیدا ہوئیں۔ قیام پاکستان کے بعد والدین کے ہمراہ ہجرت کر کے لاہور میں مقیم ہوئیں اور اپنی رحلت ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۵ء تک وہیں سکونت پذیر رہیں۔ نشاط فاطمہ کی مطبوعہ کتابوں میں سنہری گہیوں (ناول) ۱۹۶۵ء زمین کے رشتے، (ناول) آنسوں جو بہہ نہ سکے، (ناول) ۱۹۷۱ء اور پھول گرتے رہے، (ناول) ۱۹۸۱، انسان کی تلاش (افسانے) ۱۹۹۲، چاند ڈوب گیا (افسانے) ۱۹۹۳ء شامل ہیں"[۳۷]

نشاط فاطمہ کو بچپن سے مطالعے کا شوق تھا۔ ان کی ایک وجہ یہ تھا کہ ان کا گھریلو ماحول نہایت ہی ادبی تھا۔ ان کی والدہ کو ہر قسم کے ادب سے دلچسپی تھی اور مطالعے کا شوق ان کو ورثے میں ملا تھا۔ ان کے بارے میں الطاف فاطمہ لکھتی ہیں:

> "والدہ کو ہر قسم کے مطالعے کا شوق تھا۔ ادب، تاریخ، سیاست اور مختلف مذاہب سے مطلق کتب کا ذخیرہ گھر میں تھا۔ ذرہ فرصت ملی اور کچھ نہ کچھ پڑھنے بیٹھ گئیں۔ گھر میں ادبی رسالے جن میں ساقی، نیرنگ خیال، ہمایوں آتے تھے۔ اور پھول تو خود ان کے بچپن کی یادگار تھا۔"[۳۸]

کتابیں، اخبار اور رسائل ان کا جنون تھا۔ مطالعہ کی اسی عادت کی وجہ سے جب وہ مشرقی پاکستان گئیں تو وہاں وہ "کرنا فلی" اور "میانا متی" کے جنگلوں میں بھی کتاب سے ان کا گہرا رشتہ تھا۔ انگریزی کتب کے مطالعے اور انتخاب میں ایک بوڑھے فرانسیسی ایڈویزر "موسیو بیرخ" کی رہنمائی شریک حال رہی تھی۔ الطاف فاطمہ

لکھتی ہیں:

"مطالعہ کی عادت ایک خاندانی اور موروثی بیماری کے طور پر ہمارے خاندان میں نجانے کب سے فرداً فرداً منتقل ہوتی رہیں ہیں۔ یہ تکلیف اور اس کی علامات بہت کم عمری سے ہی ظاہر ہوتیں ہیں۔ مثلاً سب کچھ کرتے رہنے کے باوجود یہ محسوس کرنا کہ کچھ کیا ہی نہیں۔ وقت برباد ہو رہا ہے اور جب تک کوئی خاطر خواہ کوئی مواد نہ پڑھ لیں یوں لگے جیسے کچھ کھایا پیا ہی نہیں۔ کچھ پڑھے بغیر نیند نہ آنا۔ بے خوابی کا علاج مسکن یا خواب آور دوا یا گولی کی بجائے کتاب ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ کرنا فلی اور میانامتی میں بھی فارغ اوقات میں مطالعہ کا آغاز کر چکی تھیں۔"(۳۹)

نشاط فاطمہ کے پاس انگریزی ناولوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ انہیں سمر سیٹ، ماہم البرٹو، موراویو، ٹالسٹائی اور ہمنگ وغیرہ پسند تھے۔ انہیں اپنی کتابوں سے بے حد محبت تھی۔ اسی محبت نے انہیں ادب سے جوڑے رکھا۔ نشاط فاطمہ نے سب سے پہلا اپنا ناول "سنہری گیہوں" جو ۱۹۶۵ء میں لکھا ہے جس میں انہوں نے انسانی ذہن کی پیچیدگیوں اور اخلاقی اقدار کے زوال کے ماتم کے ساتھ جاگیر داری نظام کی خرابیوں اور خامیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ان کا دوسرا ناول "آنسو جو بہہ نہ سکے" جو ۱۹۷۱ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ یہ ناول بنگال کے قحط اور وہاں کوڑھ کے مرض کے بارے میں ہے۔ اس میں محبت کے جذبے کی آفاقیت کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کا تیسرا ناول "زمین کے رشتے" ہے جو ۱۹۹۳ء کو منظر عام پر آیا ہے۔ یہ ناول زمین سے انسان کے رشتے کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں انسانوں کی ناآسودگی کو موضوع بنایا گیا ہے جس میں ہجرت، مشرقی پاکستان کے حالات، جاگیرداروں کے استحصال اور محبت کے لافانی جذبے کو بیان کیا گیا ہے۔ چوتھا ناول "پھول گرتے رہے" جو ۱۹۸۰ء میں لکھا گیا ہے۔ یہ ناول سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں بہاریوں کا المیہ ،ہجرت در ہجرت اور وطن کی محبت اس کا موضوع رہا ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے "انسان کی تلاش" جو ۱۹۹۲ء میں جبکہ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "چاند ڈوب گیا" ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس طرح کچھ ان کے غیر مطبوعہ افسانے "محلے دار" ۱۹۹۶ء، "اپنی منزل کا تنہا مسافر" ۱۹۹۵ء، "عجب ان کی یاد کا خمار تھا" ۱۹۹۲ء، "مکتی" ۱۹۹۳ء، "چاہ بابل" اور "اپنی ذات کا تنہا مسافر" ۱۹۹۸ء ہیں۔

نشاط فاطمہ کے خاندانی پس منظر پر توجہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خاندان متحدہ ہندوستان کے علاقے اترپردیش کے قصبے خیر آباد میں مقیم تھا۔ جہاں علامہ فضل الرحمٰن خیر آبادی کے علم و فضل کا چرچا خاص وعام میں مقبول تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے میں اس خاندان کا اہم کردار تھا۔ چنانچہ اس خاندان کے افراد نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے قید و بند کی تکالیف تک برداشت کیں۔ اس ضمن میں عذرا لیاقت لکھتی ہیں:

> "نشاط فاطمہ کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جو اودھ کا ممتاز علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی شہرت کا حامل گھرانہ تھا۔ ان کے والد اترپردیش کے قصبے خیر آباد سے تھے۔ نشاط فاطمہ کے دادا فضل متین پیٹالہ ہائی کورٹ کے جج تھے جب کہ والد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ (ایم۔اے، ایل۔ایل بی) تھے۔ انہیں بیک وقت انگریزوں، عربی اور فارسی پر عبور تھا۔ حیدرآباد میں ان کی ملازمت رہی۔ مسلم ریاست "جاورہ" میں چیف سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ (۴۰)

نشاط فاطمہ کے دادا فضل متین نے بحیثیت سیشن جج ریاست پیٹالہ میں اپنی خدمات سرانجام دیں۔ آپ کی والدہ کا نام "سیدہ ممتاز جہاں" تھا۔ وہ ایک سچی، بے باک بے دھڑک خاتون تھیں۔ نشاط فاطمہ اپنے پانچ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر رہ کر حاصل کی۔ بعد ازاں مسلم سوسائٹی کے ہائی سکول "تعلیم گاہ" میں داخل ہوئیں۔ تیرہ برس کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد مہیلا ودیالہ کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن تقسیمِ ہند کے پیشِ نظر پیدا ہونے والے ملکی حالات کی وجہ سے انہیں اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان ہجرت کرنا پڑی۔ یہاں آکر انہوں نے "اسلامیہ کالج کوپر روڈ" میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کو آگے بڑھایا۔ بعد ازاں اپنے خالہ زاد کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھ گئیں۔ تین بیٹوں اور ایک بیٹی کی شکل میں یہ خاندان اس وقت صدمے سے دوچار ہوا جب سقوطِ ڈھاکہ کے کچھ عرصے بعد نشاط فاطمہ کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ ان کی شخصیت میں خودداری بچپن ہی سے موجود تھی۔ چنانچہ بیوگی اور کسمپرسی کے اس دور کا دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے بجائے اپنے دم پر گھر کی ذمہ داریاں اور بچوں کی تعلیم تربیت

کے اخراجات کی ذمہ داری اٹھائی۔ اس حوالے سے نورین رزاق لکھتی ہیں:

"نشاط فاطمہ زندگی کی کریہہ، سفاک اور کرب ناک حقیقتوں کی کہانی کار ہیں۔ ان کے ہاں سماجی اور عصری زندگی کے دکھ بھرے قصے، انسانی بے حسی، بے ضمیری، جدید اور قدیم طرز زندگی کا تقابل اور انسانی المیوں کو جنم دینے والے عوامل و عناصر پر گہری نظر دیکھائی دیتی ہے۔"(۴۱)

اس مشکل حالات کے باوجود اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ممالک بھیج اور تنگ دستی اور پریشانی کا ثابت قدمی سے مقابلہ کیا۔ اکتوبر ۱۹۹۵ء میں یہ عظیم خاتون اپنی اولاد اور ہزاروں ادب دوست سوگواروں کو چھوڑ کر راہی ملکِ عدم ہوئیں۔

حوالہ جات

۱۔ افتخار علی شیخ، پاکستان توڑنے والے، المطبتہ العربیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۶۹

۲۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، پاکستان کیوں ٹوٹا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء ص ۱۱۹

۳۔ زاہد چوہدری، مشرقی پاکستان کی تحریک علیحدگی کا آغاز، شرکت پرنٹنگ پریس روڈ، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۸

۴۔ سردار شوکت علی، بھٹو ضیا اور عوام، رحمت شاہ آفریدی فرنٹیر پوسٹ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۷۰

۵۔ کرنل سید مقبول حسین، کیمپ ۴۵، محمود پرنٹنگ پریس، روالپنڈی، ۲۰۰۵ء ص ۴۳

۶۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، الفصیل ناشران و تاجران کتب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۴۱

۷۔ محمد اصغر خان، جرنیل سیاست میں، س، ن ۱۹۹۳ء، ص ۳۱

۸۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، الفصیل ناشران و تاجران کتب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۹۴

۹۔ محمد عاصم بٹ، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۶۳۰

۱۰۔ ارشد محمود آصف، اردو افسانہ اور آزادی اظہار کے مسائل، مقالہ (غیر مطبوعہ)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۳

۱۱۔ کرنل سید مقبول، زندہ رہے گا پاکستان، اے آر پرنٹرز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۲۶

۱۲۔ جنرل کے ایم عارف، ضیاء الحق کے ہمراہ، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء، ص ۶۸

۱۳۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، پاکستان میں میری محبت، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۷، ص ۲۲۴

۱۴۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، الفصیل ناشران و تاجران کتب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۵

۱۵۔ سلیم آغا قزلباش، اردو افسانے کے پچاس سال، ماہ نامہ اوراق، لاہور، ۱۹۹۸، ص ۲۸

۱۶۔ شمائل ریاض، ام عمارہ کی تحریروں میں سقوط ڈھاکہ اور ترقی پسند تحریک کے عناصر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۴، ص ۲۶

۱۷۔ توصیف احمد، آدھا پاکستان، نگارشات، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۸۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۲۰۔ شہزاد منظر، ادب میں انتہا پسند رجحانات، مشمولہ، ماہ نامہ فنون (مدیر: احمد ندیم قاسمی) لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۴

۲۱۔ ابراہیم جلیس، الٹی قبر، مکتبہ جلیس، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۳۲

۲۲۔ رضیہ فصیح احمد، بارش کا آخری قطرہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۹۰

۲۳۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱، ص ۸۸

۲۴۔ انتظار حسین، قصہ کہانیاں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۰۹

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۲۶۔ علی حیدر ملک، پروفیسر، بے زمین بے آسمان، کراچی، ایجوکیشنل پریس، ۱۹۸۶، ص ۷۲

۲۷۔ اختر جمال، زرد پتوں کا بن، اتحریر، لاہور، ۱۹۸۱، ص ۴۱

۲۸۔ مسعود اشعر، آنکھوں پر دونوں ہاتھ، ملتان، خلاقین، ۱۹۷۵ء، ص ۲۳

۲۹۔ مسعود مفتی، چند یادیں، مشمولہ: وطن کا قرض (مرتبہ: قصریٰ دیگر) س ن، ص ۱۶۸

۳۰۔ مسعود مفتی، ریزے، اقرا، اسلام آباد، ۱۹۷۹، ص ۳۱

۳۱۔ اے خیام، کیل و ستور کا شہزادہ، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۔۱۴

۳۲۔ اے حمید، اب جاگتے رہنا ہے، مشمولہ: ماہ نامہ فنون (مدیر: احمد ندیم قاسمی) لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۵۸

۳۳۔ انور عنایت اللہ، ستم در ستم، مشمولہ: وطن کا قرض (مرتبہ: قیصر، قیصریٰ و دیگر) ایوان ادبیات، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۴

۳۴۔ آغا سہیل، پرچم، مشمولہ: ماہ فنون (مدیر: احمد ندیم قاسمی) لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۳۶

۳۵۔ ام عمارہ، کس نے کس کو اپنایا، مشمولہ: ماہ فنون (مدیر: احمد ندیم قاسمی) لاہور ۱۹۷۳ء ص ۸۲

۳۶۔ منشا یاد، بند مٹھی میں جگنو، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۰ء، ص ۳۳، ۳۴

۳۷۔ زینت افشاں، ڈاکٹر، اردو فکشن پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۱۶، ص ۱۶۵

۳۸۔ الطاف فاطمہ (بہن نشاط فاطمہ) مضمون، نشاط فاطمہ میری بہن، ماہنامہ تجدید نو، نشاط فاطمہ نمبر، ۱۹۹۸، ص ۱۹۔۲۰

۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ عذرالیاقت، بیسویں صدی کی نمائندہ افسانوی نثر نگار خواتین (تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم فل اردو) بہاؤ الدین زکریایونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۳، ص ۱۹۴

۴۱۔ نورین رازق، ڈاکٹر، پاکستانی خواتین افسانہ نگار اردو افسانے کی روایت کے تناظر میں، دستاویز مطبوعات، لاہور س ن، ص ۴۳۷

باب دوم:

سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں نشاط فاطمہ کی افسانہ نگاری:

واقعاتی تناظر میں تجزیاتی مطالعہ

الف) سقوط ڈھاکہ سے پہلے کے واقعات اور صورتحال

متحدہ ہندوستان کے اندر مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں آباد تھیں۔ مسلمانوں نے کئی سالوں تک ہندوستان پر راج کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ ہندوؤں نے انگریزوں کا تسلط تسلیم کر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور بڑی حد تک اپنی بقا کی جنگ جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسری طرح مسلمانوں کی زندگی مفلوج حال ہوتی چلی گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آنے والے زمانے میں مسلمان قوم کو مکمل طور پر غلام بنایا جائے گا۔ مسلمانوں کی مشکلات کم کرنے اوران کے مسائل حل کرنے کے لیے سر سید احمد خان، سر آغا خان، علامہ محمد اقبال، مولانا محمد علی جوہر، اے کے فضل الحق اور قائد اعظم محمد علی جناح جیسے رہنما میدان میں آئے اور بالا آخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی صورت میں ایک نیا ملک حاصل کیا۔ اس نئے ملک کے حصول کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، معاشی، سماجی اور معاشرتی ترقی کا حصول تھا تاکہ مسلمان آزاد خطے میں رہ کر ترقی کر سکیں۔ لطیف احمد شیروانی لکھتے ہیں:

> "ہندوستان میں مغربی جمہوریت کے اصولوں کا مختلف ملّتوں کے وجود کو تسلیم کیے بغیر اطلاق ممکن نہیں لہذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان میں ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے بالکل حق بجانب ہے۔ میری ذاتی طور پر خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ضم کر دیا جائے، خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود مختاری حاصل کرے، خواہ اس کے باہر مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔"(۱)

ہندو اور انگریز دونوں تقسیم ہند کے خلاف تھے۔ وہ مختلف قسم کی تدابیر کر رہے تھے کہ کسی طرح یہ تقسیم رُک جائے لیکن جب ان کو اس سلسلے میں ناکامی ہوئی تو پاکستان کی نئی انتظامیہ کی مشکلات بڑھانے کے لیے ہندوستان کو دس ماہ قبل تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فروری ۱۹۴۷ء برطانوی براعظم لاڈ داٹیلی نے ۱۹۴۷ء تک برصغیر کے باشندوں کو اقتدار منتقل کرنے کا اعلان کر دیا۔ ہندوستان کے اندر لارڈ ماونٹ بیٹن کو نیا وائسرائے مقرر کر دیا گیا۔ لارڈ ماونٹ بیٹن نے سیاسی قائدین سے ملاقات کر کے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کو تقسیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے بعد پاکستان کی نئی انتظامیہ کی مشکلات واضح طور پر بڑھتی نظر آ رہی تھیں۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مشکلات سے بھرے ہوئے پاکستان کی ذمہ داری قائداعظم اور نئی انتظامیہ کے کندھے پر ڈال دی گئی۔ پاکستان کے بہت سارے علاقے غیر منصفانہ طور پر عین موقع پر ہندوستان کے حوالے کر دیے گئے۔ اس ساری صورتحال کی وجہ سے پاکستان کی انتظامیہ کو بہت ساری مشکلات برداشت کرنے کے باوجود مجبوراً تقسیم قبول کرنا پڑی۔ عبدالرحمٰن منشی لکھتے ہیں:

> "ہندوستان کی تقسیم اب آخر ہو چکی ہے۔ بلاشبہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس عظیم اور خود مختار سلطنت کی ساخت میں سخت بے انصافیاں کی گئیں ہمیں امکانی حد تک دبایا گیا اور محدود کیا گیا۔ ہم پر جو آخری ضرب لگائی گئی وہ باونڈری کمیشن کا فیصلہ ہے۔ یہ ایک غیر منصفانہ قابل فہم، بلکہ مکروہ فیصلہ ہے لیکن یہ غلط ہو، غیر منصفانہ ہو مکروہ ہو۔ یہ عادلانہ فیصلہ نہ ہو۔ بلکہ سیاسی فیصلہ ہو۔ بہرحال ہم اس کی پابندی کا وعدہ کر چکے ہیں۔ لہذا ہم پر اس کی پابندی واجب ہے۔ ہمیں ایک آبرودار قوم کی طرح اس کو قبول کر لینا چاہیے۔"(۲)

مسلمانوں کی ترقی کا راز قائداعظم کی نظر میں آزاد اسلامی ریاست کے حصول میں تھا۔ ہندوؤں اور انگریزوں کا خیال تھا کہ پاکستان کا قیام صرف چند ماہ کی کہانی ہے۔ اس لیے پاکستان کو دولخت کرنے کے لیے غیر منصفانہ تقسیم کی اور مسلم اکثریتی علاقے جو اصولاً پاکستان میں شامل ہونے تھے انھیں ایک سازش کے تحت بھارت کے حوالے کر دیا گیا۔

زینت افشاں لکھتی ہیں:

"قائداعظم محمد علی جناح کی مثالیں بہت اعتماد کے پیش کی جا سکتی ہیں۔ کئی سو سال برصغیر پر مسلمانوں نے حکومت کی اور اس ملک نے بے مثال ترقی کی لیکن مسلمانوں سے اقتدار چھینا تو انگریزوں نے اپنے خاص انداز حکمرانی کے ذریعے مقامی قومیتوں کو آپس میں لڑا کر تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں کو ایسا نمایاں کیا کہ آج بھی اس کے اثرات سے قومیں نکل نہیں سکیں۔"(۳)

کانگریس اور ماؤنٹ بیٹن کے گٹھ جوڑ کی وجہ سے پاکستان کی انتظامی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم میں بد دیانتی کی۔ ان کے ان اقدام کی بدولت صوبہ پنجاب اور صوبہ بنگال کے مسلم اکثریتی علاقے ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے۔ ضلع گورداسپور کی مسلم اکثریت والی تین تحصیلیں، گورداسپور، پٹھانکوٹ، بٹالہ، ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ اور فیروز پور بنگال کی حد بندی کے وقت ضلع مرشد آباد، ندیہ اور کلکتہ کے علاقے ایک سازش کے تحت ہندوستان کو دے دیے گئے۔ خاص کر گورداسپور کا علاقہ ہندوستان کو دے کر بھارت کو کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے لیے راستہ دے دیا گیا۔ الغرض تقسیم کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ جس کی وجہ سے ۱۹۴۷ء ۱۹۶۵ء ۱۹۷۱ء اور ۱۹۹۹ء میں چار پاک بھارت جنگیں ہو چکی ہیں۔ بقول پروفیسر احمد جاوید:

"تقسیم کا پہلا نتیجہ تو لاکھوں انسانوں کی نقل مکانی تھی۔ قتل وغارت کا بازار گرم ہوا، لوٹ مار ہوئی اور عصمتوں پر حملے ہوئے۔ وہ ہوا کہ جس کا نظارہ چشم حیرت نے اس خطے میں اس سے قبل اس طرح نہیں کیا تھا۔"(۴)

قیام پاکستان سے قبل اعلیٰ تعلیم کے حصول کے باعث ہندو سرکاری ملازمتوں پر فائز تھے۔ تقسیم کے بعد یہ ہندو ہندوستان ہجرت کر گئے اور جاتے ہوئے دفتری سامان حتٰی کہ ٹائپ رائیٹر بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد ہر محکمے میں تجربہ کار عملے کی بے حد کمی پیدا ہو گئی۔ جس سے انتظامی مشکلات میں اضافہ ہوا۔

متحدہ ہندوستان کے مرکزی بنک (ریزرو بنک) میں چار ارب (چار بلین) جمع تھے۔ تناسب کے لحاظ سے

ان میں سے ۷۵ کروڑ (سات سو پچاس ملین) پاکستان کو ملنے تھے۔ لیکن یہاں بھی ناانصافی سے کام لیا گیا۔ بھارتی وزیر سردار پیٹل نے یہ شرط لگائی کہ پاکستان کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضہ کو اگر تسلیم کرلے تو اس کو یہ رقم مل سکتی ہے۔ لیکن پاکستان نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ پاکستان کو شرائط کے مطابق فوجی اثاثوں میں ۳۶ فیصد اور بھارت کو ۶۴ فیصد حصہ ملنے کا معاہدہ ہوا تھا۔ مگر وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر صفدر محمود رقمطراز ہیں:

> "جغرافیائی لحاظ سے بھی مشرقی پاکستان کی حیثیت بڑی نازک تھی۔ اس کے اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک ہزار میل بھارتی علاقہ حائل تھا۔ مشرقی پاکستان تین اطراف سے بھارتی علاقے میں گھیرا ہوا تھا۔"(۵)

ہندوستان میں سولہ اسلحہ ساز فیکڑیاں تھیں۔ پاکستان کے حصّے میں ایک بھی اسلحہ فیکڑی نہ ہونے کی وجہ سے ۶۰ ملین روپے دینے کا وعدہ کیا گیا۔ مگر یہاں بھی پاکستان کے ساتھ عہد وفا نہ کیا گیا۔ تقسیم برصغیر سے دریاؤں کے قدرتی بہاؤ پر بھی اثر پڑا۔ پنجاب کو سندھ کے پانچ معاون دریا، ستلج، راوی، چناب، بیاس اور جہلم سیراب کرتے تھے۔ ریڈکلف نے تقسیم کے وقت دریائے راوی کا مادھوپور ہیڈورکس اور دریائے ستلج کا فیروز پور ہیڈور بھارت کے حوالے کر کے پاکستان کی مشکلات میں اضافہ کیا جو ۱۹۶۰ء میں عالمی بنک کے تعاون سے سندھ طاس معاہدے کی صورت میں حل کروایا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد وقتی طور پر آل انڈیا ایکٹ کو ضروری ترامیم کے ساتھ ملک پر نافذ تو کر دیا گیا لیکن دستور ساز اسمبلی میں بعض ارکان اسمبلی کے غیر اسلامی ذہن اور منفی رویے کی وجہ سے آئین بنانے میں تاخیر ہوئی۔ جس سے آئینی مشکلات سامنے آئیں۔ اس طرح انگریز دور میں برصغیر میں ۶۳۵ خود مختار یا نیم خود مختار ریاستیں تھیں۔ ہندوستان نے ان ریاستوں پر جبری قبضہ کر کے پاکستان کو وسیع مسلم علاقوں سے بھی محروم کر دیا۔ اس ساری صورتحال اور واقعات نے قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ کر دیا۔ قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کے لیے اس طرح کی مشکلات کوئی نئی بات نہیں تھیں قیام پاکستان سے قبل بھی متحدہ ہندوستان کے اندر ہندوؤں نے مسلمانوں پر زندگی سخت کر دی تھی۔ مسلمان، سیاسی، مذہبی، معاشی حوالے مفلوج حال ہو گئے تھے۔ ان مشکلات ہی نے ان کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ ایک آزاد ریاست حاصل کریں، جہاں وہ سکھ کا سانس لے سکے، جہاں ان کو آزادی ہو، جہاں وہ مذہبی

سیاسی، معاشی حوالے سے محفوظ ہوں اسی کی عکاسی نشاط فاطمہ نے یوں کی ہے:

"اگر پاکستان نہیں بنے گا تو یاد رکھو ہم سب بھنگی چمار بن کر رہیں گئے اس ملک میں ویسے میرا ایمان ہے کہ پاکستان بن کر رہے گا۔"(۶)

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی سربراہی کا مسئلہ بھی درپیش آیا۔ گورنر جنرل لارڈ ماونٹ بیٹن سربراہ بننا چاہتا تھا۔ لارڈ ماونٹ بیٹن اسلام دشمن عناصر کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ اس لیے گورنر جنرل کا عہدہ قائداعظم نے خود سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے لارڈ ماونٹ بیٹن کی انا کو ٹھیس پہنچی۔ وہ پاکستان کو نقصان پہنچانے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ آزادی کے ایک سال بعد بد قسمتی سے قائداعظم وفات پا گئے۔ قائداعظم کی وفات کے بعد ملک کے اندر کوئی ایسا رہنما نہ ملا جس نے ہماری صحیح رہنمائی کی بلکہ زیادہ تر حکمرانوں نے ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور ملک کے وسائل کو صحیح استعمال کر کے لوگوں کی مشکلات کم کرنے کے بجائے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دونوں میں لوگوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ خاص کر مشرقی پاکستان کے لوگوں کی مشکلات میں آئے روز اضافہ ہوتا رہا۔ جس سے وہ معاشی بدحالی کا شکار ہونے لگے۔ کسمپرسی کی زندگی گزرنے کی وجہ سے اور حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے مغربی پاکستان کے لوگوں میں مایوسی پھیلی۔ اس سے زیادہ تر مشرقی پاکستان کے لوگ سخت مایوس اور نالاں نظر آئے۔ لیفٹیننٹ کرنل ذوالفقار علی خان رقمطراز ہیں:

"۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آیا تھا۔ دنیائے اسلام کے عمائدین نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ قرار دیا۔ ادھر دشمن عناصر نے اس قلعے پر پے در پے وار کیے۔ میدان جنگ میں، میدان سیاست میں اور معاشی محاذ پر۔ لیکن ہم نے جان ومال کے نذرانے پیش کیے اور ثابت قدم رہے۔ کچھ ٹھوکریں بھی کھائیں، اپنے ہی دست وبازو پر بھی وار کیے، لیکن آخر چشم بینا نے ہماری رہنمائی کی۔"(۷)

افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں نشاط فاطمہ نے سقوط ڈھاکہ کے حالات وواقعات اور فسادات کو موضوع بنایا۔ جن میں سقوط ڈھاکہ کے حالات وواقعات پر توجہ دلائی گئی اور ایسے افسانے تخلیق کیے جن میں سقوط ڈھاکہ کے دوران حالات وواقعات کی حقیقی تصویر قارئین کے پاس پہنچی۔ اس دور میں تمام مصنفین کی توجہ چونکہ پاکستان بننے کے بعد کے حالات واقعات اور کشیدہ صورتحال پر تھی اس لیے ان موضوعات کے

متعلق افسانے تخلیق کیے گئے جن میں خارجی عوامل کی پیش کش کی جا سکے۔ نشاط فاطمہ زندگی کی کرب ناک حقیقتوں کی کہانی کار ہیں۔ عصری اور سماجی زندگی کے دکھ بھرے قصے، بے ضمیری، انسانوں کی بے حسی اور انسانی المیوں کو جنم دینے والے عوامل اور عناصر پر مصنفہ کی گہری نظر تھی۔ طنز کا دامن انسانی فوجوں کی عکاسی کرتے ہوئے نہیں بچا سکیں۔ نشاط فاطمہ کے ہاں قابل رحم حالت، نت نئے پھوٹنے والے فسادات اور حالات وواقعات مرکزی موضوع ہیں۔ سقوط ڈھاکہ سے پہلے کے واقعات اور صورتحال کی عکاسی نشاط فاطمہ نے افسانے "گم کردہ راہ منزل"، "انسان کی تلاش"، "وقت کی صلیب"، "بھر بھری ریت کا طوفان" میں کی ہیں۔

سقوط ڈھاکہ سے قبل ہر طرف خون ہی خون تھا جس کی وجہ سے شہر کے اندر امن اور محبت کے نغمے ختم ہو گئے۔ قتل وغارت گری، گولیوں کی صدائیں، بموں، سازشی عناصر کی تخریب کاری اور دہشت گردی نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے حسن کو جھلسا کر رکھ دیا۔ امبر شہزادی رقمطراز ہیں:

> "سانحہ مشرقی پاکستان ایک ایسا المیہ تھا جس نے پاکستانی قوم کو شدید احساس ذلت اور احساس شکست میں مبتلا کر دیا۔ ایک ہی قوم کے دو گروہوں کے درمیان علاقائی بنیادوں پر تضادات ابھرے اور ان تضادات نے ایک ایسے تہذیبی المیے کو جنم دیا جس سے ہر محب وطن پاکستانی کی قومی اور ذاتی زندگی براہ راست متاثر ہوئی۔"(۸)

سقوط ڈھاکہ کے المیے کی وجہ سے شہر کے اندر خوفزدہ رہنے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس سلسلے میں حکومتی اقدام اور دعوے ناکام اور جھوٹے ہوئے۔ عنایت اللہ رقمطراز ہیں:

> "مغربی پاکستان سے تو ہندو ۱۹۴۷ء میں بھارت چلے گئے۔ مشرقی پاکستان سے وہاں کے باشندے نہ نکلے۔ تجارتی اور ثقافتی اداروں پر ان کا قبضہ رہا۔"(۹)

ظلم کا شکار ہونے والے لوگوں کو سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ اس بار ظلم کرنے والے لوگ اپنے ہی لوگ تھے۔ اپنے ہی لوگوں کی وجہ سے لوگ عدم تحفظ کا شکار ہو گئے۔ نشاط فاطمہ نے اپنے افسانوی مجموعوں کے اندر ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۱ء کے قیامت خیز مناظر کی عکاسی کی ہے۔ ظلم، فسادات اور خون جیسے واقعات کو مصنفہ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انھوں نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو آگ کے شعلوں اور فسادات میں لپیٹا ہوا دیکھا۔ جلاوطنی کے دوران عذاب سے دوچار لوگوں کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مصنفہ

براہ راست حالات اور واقعات کی عینی شاہد تھیں۔ نشاط فاطمہ کے افسانوں میں ہجرت اور فسادات بطور خاص موضوع ہیں۔ جھلستے، تڑپتے اور جلتے لوگ اپنا ہی وطن نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کی کہانیوں میں نثری نظموں اور اشکار کا حوالہ بھی موجود ہے۔ انہوں نے سقوط ڈھاکہ کے دوران پیش آنے والے حالات اور واقعات کو اپنے دو افسانوں مجموعوں "انسان کی تلاش" اور چاند ڈوب گیا" میں پیش کیا۔

جس دور میں نشاط فاطمہ نے اپنی تحریری سرگرمیوں کا آغاز کیا وہ سقوط ڈھاکہ کے حالات وواقعات قلمبند کرنے کے لیے سازگار نہیں تھا لیکن انہوں نے بڑی جرات اور بہادری کے ساتھ اس دور کے حالات وواقعات کی نہایت عمدگی کے ساتھ عکاسی کی۔ سقوط ڈھاکہ نے ادیبوں، شاعروں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ قیام پاکستان کے بعد سیاسی عدم استحکام کے باعث ملک سازشی عناصر کا شکار ہوا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات، مجیب الرحمٰن اور بھٹو کے اختلافات کی بدولت ملک کے اندر حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے۔ کراچی اور چٹاگانگ میں قتل وغارت اور خون ریزی جیسے المناک واقعات کی بدولت لوگوں میں مایوسی اور خوف پھیلا۔ ایک ہی سرزمین پر اکھٹے رہنے والے باشندے نفرت کی آگ میں اس قدر جھلس گئے کہ اس ملک کو دولخت ہونا پڑا۔ نشاط فاطمہ نے دو تقسیموں کے حوالے سے مہاجرین کے المیوں، دکھ، مصیبت اور درد کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا کہ اس دور کی کی اصل تصویر قارئین کے سامنے آجاتی ہے کہ جیسے قارئین خود ان حالات وواقعات کو دیکھ رہے ہوں۔ ڈاکٹر نثار ترابی رقمطراز ہیں:

> "۱۹۷۰ء کے انتخاب کے بعد ملک جب سیاسی عدم توازن کا شکار ہوا تو اس نے ملک کو ایک ایسے سیاسی بحران سے دوچار کر دیا کہ آئین سازی کے عمل سے لے کر شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی اختلافات کی خلیج حائل ہونے تک قومی صورتحال اس قدر مخدوش ہو گئی کہ کراچی سے ڈھاکہ تک ہر علاقہ غیر یقینی سیاسی کیفیت کا نقشہ پیش کرنے لگا۔ چٹاگانگ اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں قتل وخون ریزی کے لرزہ خیز واقعات روز کا معمول بننے لگے۔ مارچ ۱۹۷۱ء کے ابتدائی دنوں میں سیاسی حالات وواقعات میں ظلم بربریت کی انتہا کر دی گئی۔"(۱۰)

نشاط فاطمہ نے مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران بنگال کی حقیقی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا جس کی

وجہ سے ان کے احساس اور شعور پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اسی تناظر میں نشاط فاطمہ کا افسانہ "گم کردہ رہِ منزل" ہے۔ جس میں سقوط ڈھاکہ سے پہلے کے واقعات اور صورتحال کی تصویر کشی کی گئی ہے:

"ان دونوں رات بھر بجلی غائب رہتی تھی۔ مٹی کے تیل اور موم بتیاں دونوں کی کا کال تھا۔ یہ وہ تھا جب آدمی آدمی کی گھات میں ہوا چاہتا تھا۔۔۔ چاروں طرف آدمیوں کا ایسا شور تھا جیسے اکیلی رات گیڈر چلا رہے ہوں۔ شور لحہ لحہ ساعت ساعت بڑھ رہا تھا۔"(۱۱)

پاکستان کو دولخت کرنے میں پاکستانی حکمرانوں کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ دونوں جانب شور پھیلنے لگا۔ لوگوں کی آوازیں گیڈر کی طرح رات کو آنے لگی۔ لوگ گھروں میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ موت کی آہٹ چاروں جانب سنائی دی جانے لگی۔ مسعود مفتی رقمطراز ہیں:

"ان دنوں مشرقی پاکستان میں ہر فرد بے بسی اور بے چارگی کی مکمل تصاویر تھا۔ امید ہار چکی تھی، خدا نارض لگتا تھا، سیاست مفلوج تھی۔ رہبروں پر رہزنی کا گمان ہوتا تھا۔ گردوپیش میں سازشیں تھیں۔ ماحول میں تناؤ اور ہیجان تھا۔ ہمسائے بھی ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دھماکے برات کے گولوں کی طرح تھے۔۔۔ خون کے چھینٹے پان کی پیک کی طرح عام تھے۔"(۱۲)

بہت سے لوگ اس خوش گمانی میں مبتلا تھے اور ان کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہی یہ وقعتی ابال کم ہو جائے گا۔ مسلمانوں اور بنگالیوں کے دیرانہ خوش گوار، روابط اور تعلقات نہیں ٹوٹے گئے لیکن دلوں کے اندر نفرت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لوگ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہو گئے۔ اور اس کی عکاسی یوں کی ہے:

"عروس البلاد شہر کراچی کی سڑکیں ویران ہیں۔ صبح سے شام تک کرفیو، ہسپتال میں زخمی زیادہ اور چارہ گر کم اور بے رحم۔"(۱۳)

سقوط ڈھاکہ کے حالات وواقعات کی خرابی کی وجہ سے برسوں کے رشتے ایک لمحے میں لوگ توڑنے پر تلے تھے اور دوسری طرف اس گمان میں بھی مبتلا تھے کہ علیحدہ ہونے کے باوجود بھی رشتوں کا احترام اور تقدس قائم رکھیں گئے۔ اور اس سرزمین پر خون کہ ندیاں نہ بہنے دیں گئے۔

قیام پاکستان کے بعد انسانی روپ میں ابلیس موجود تھا۔ تخریب کاری کا عنصر بہت بڑھ گیا تھا روحانی اقدار اور اخلاقی اقدار کی شکست ریخت کی اہم وجہ اقتدار کی ہوس تھی۔ مسلمان ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی بجائے تنزلی کی راہ پر چل نکلے لیکن مفادات کی جنگ آپس میں شروع ہو گئی۔ فرقہ پرستی، سمجھوتہ بازی، تنگ نظری کی فضا پیدا ہوئی۔ اور ملت کا شیرازہ بکھیرنے لگا:

"یہ کراچی ہے عجیب چکر ہے۔ آپ نہ ماضی سے فرار حاصل کر سکتے ہیں اور نہ حال سے۔۔۔ شائیں شائیں گولیاں چل رہی ہیں۔ کرفیو کی خلاف ورزی کرنے پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تیور کر گرتا ہے۔ دراصل وہ بھول کر مقررہ وقت پر مسجد میں نماز پڑھنے نکل آیا ہے۔"(۱۴)

نشاط فاطمہ نے افسانہ "گم کردہ رہ منزل" میں سقوط ڈھاکہ کے حالات وواقعات کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب سقوط ڈھاکہ کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا تو اس سے قبل بھی حالات آئے روز سنجیدہ ہو گئے تھے کہ اگر کوئی باہر نکلتا تو بغیر سوچے سمجھے قتل کر دیا جاتا گھروں سے باہر جانے والے گولیوں کے بھینٹ چڑھ جاتے۔

ان میں اکثر وہی لوگ تھے جنہوں نے قیام پاکستان کے لیے جدوجہد کی تھیں اور جنہوں نے پاکستان کے لیے بہت سی دشواریاں اٹھائی تھیں تو اس وقت مسلمانوں کے دلوں کے اندر صرف ایک الگ وطن کی خواہش تھی غلامی سے نجات کے مسلمانوں نے مل کر جدوجہد کی تھیں:

"غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا عمل کتنا طویل، کتنا قدیم، اور کتنا دشوار کن تھا اور اب۔۔۔ پاکستان کے لیے دشواریاں اٹھائی تھیں اور سلسلہ کی ایک بات ہو تو بتائی بھی جائے۔"(۱۵)

افسانہ "گم کردہ رہ منزل" میں یہ لوگ وہی تھے جنہوں نے پاکستان حاصل کرنے کے لیے بے حد جدوجہد اور محنت کی تھیں۔ افسانہ کا مرکزی کردار "ابا" جس نے پاکستان کی خاطر پولیس کے ڈنڈوں کو بھی برداشت کیا۔ لیکن بعد میں یہی جذبے مانند پڑ گئے۔ جو جوش اور جذبہ پاکستان حاصل کرنے کے لیے تھا۔ وہ جوش وجذبہ بچانے کے لیے نہیں تھا۔

جس جگہ آدمی ملازمت اور تجارت کی غرض سے مستقل سکونت اختیار کرلے، اپنے ساتھ اہل وعیال

کو بھی رکھ لے اور اپنا گھر بار بھی بنالے تو اس جگہ کے ساتھ انسان کا فطری لگاؤ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی یادیں جڑ جاتی ہیں اور وہی اس کا وطن بھی کہلاتا ہے۔ وطن اصلی، انسان کا اپنا شہر جس کو اس نے اپنے اور اہل وعیال کے ساتھ جوڑ دیا ہو اس مٹی کو اس لیے وطن سمجھتا ہے کہ اس کے آباؤاجداد کے ساتھ گزرا ہوا وقت اور یادیں اسے زندگی بھر اس مٹی سے جوڑے رکھتی ہے۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل بھی ملک کے اندر صورتحال ایسی تھی کہ ہر شخص ذاتی مفاد کے بارے میں سوچتا تھا۔ ملک کے اندر اپنے شہریوں کو بھی بہت سارے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ الغرض ملک کے اندر رہ کر بھی لوگوں کے ساتھ اجنبیوں جیسا سلوک ہوتا تھا۔ نشاط فاطمہ نے بھی اپنے افسانے "انسان کی تلاش" میں یوں عکاسی کی ہے:

> "انسان تو ہوں گئے یہاں تو ہر چیز پیسہ ہے۔۔۔ میں جھنجھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وطن وطن وطن کی وضاحت کیا ہے۔ میں جہاں پیدا ہوا۔ وہ بھی میرا وطن قرار نہ دیا گیا۔۔۔ ان کا وطن نہ بنا۔ یہ وطنیت آخر ہے کیا چیز۔"(۱۶)

پاکستان کے اندر کے حالات کی کشیدگی کی وجہ پیسے کی اہمیت تھی۔ ہر کوئی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش اپنے دل میں لیے دوسروں کو گرانا چاہتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت سے دوچار لوگوں کو جب یہ احساس ہونے لگا کہ اب ان کو دوبارہ ہجرت کرنا پڑے گئی تو اسی احساس میں ڈوبے ہوئے لوگ اس سوچ میں مبتلا ہو گئے کہ آخر وطن کیا ہے۔ نشاط فاطمہ نے اپنے افسانے "انسان کی تلاش" میں حالات وواقعات میں پسے ہوئے لوگوں کی عکاسی کی ہے جو اس کشمکش سے دوچار تھے کہ آخر ان کا اپنا وطن کون سا ہے۔

افسانہ "وقت کی صلیب" سقوط ڈھاکہ سے قبل کے حالات وواقعات کا عکاس ہے۔ افسانہ کی مرکزی کردار "واحد متکلم" اپنے شوہر کے مر جانے کے بعد اپنے دونوں بچوں کی پرورش کرتی ہے۔ پینشن اور سکول کی تنخواہ اپنے بچوں پر نچھاور کرتی ہے تاکہ اس کے بچے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکے۔ لیکن بچے بڑے ہو کر اپنا مقام حاصل کرنے کی منزل پر جب پہنچ جاتے ہیں تو وہ اپنی ماں کو بھول کر اپنی الگ دنیا بسا لیتے ہیں۔ وہ اپنی ماں کی قدر اور ان قربانیوں کو بھی بھول جاتے ہیں جو اس نے ان کو بہتر زندگی فراہم کرنے کے لیے برداشت کیے تھے۔ نشاط فاطمہ نے افسانہ "وقت کی صلیب" میں پاکستان کو ماں سے تشبیہ دی ہے۔ وہ ماں جو لاکھوں قربانیوں

کے بعد اپنے بچوں کو ایک سر زمین میں اکٹھا کرتی ہے۔ لیکن بچے اس سر زمین کی حفاظت کرنے کے بجائے آپس میں الجھ پڑے۔ ایک دوسرے کے لیے دلوں میں اتنی نفرت پیدا کرلی کہ اکٹھا رہنے کا جواز ختم کر ڈالا:

"عبادت گاہوں میں لوگ سکون، یکسوئی اور طمانیت کی خاطر تھے رگڑتے ہیں۔ شمعیں فروزاں کرتے ہیں مگر ایسی کسی کیفیت کا نام ونشان بھی اس کے چہرے پر عیاں نہ تھا، وہ تو جیسے ایک بیقرار روح تھی جو وقت کے ساتھ بھٹک رہی تھی۔"(۱۷)

لوگ عبادت گاہوں میں سکون کی تلاش کے لیے جاتے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں نے اپنا الگ وطن پاکستان حاصل کیا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کے جذبے ماند پڑنے لگے۔ جوش وخروش کے نشان بھی ان کے چہروں سے ختم ہو گئے۔ ان کی روح ایسی ہو گئی کہ جن میں عقل وفہم اور شعور کا خاتمہ ہو گیا۔ مشرق اور مغرب کے لوگ وقت کے ساتھ بھٹکنے لگے۔

نشاط فاطمہ نے قیام پاکستان کے بعد درپیش سیاسی اور سماجی مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ تقسیم کے بعد اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ اور باقی جو پاکستان منتقل ہوئے ان کا بھی آپس میں نفرت انگیز رویہ بڑھتا گیا۔ لوگوں کے جذباتی ونفسیاتی مسائل کا مشاہدہ نشاط فاطمہ نے براہ راست کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ایک ایسا سناٹا پیدا ہونا شروع ہوا جو کسی خطرے کی علامت تھا لوگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ خاموش رویہ اور اختلافات بڑھنے لگے۔ فرقہ پرستی کی بدولت خطرے کے بادل منڈلانے لگے۔

"فضا میں گہرا سناٹا ہے۔ ایسا سناٹا جو کسی خطرے کے سائرن بجنے سے پہلے طاری ہوتا ہے"(۱۸)

قیام پاکستان سے پہلے مشرقی پاکستان کے مسلمان تعلیمی لحاظ سے پسماندہ تھے۔ تعلیمی ادارے زیادہ تر ہندوؤں کی ملکیت تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہی صورتحال قائم رہی۔ دراصل قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلے تعلیمی نظام بدلنے کی ضرورت تھی۔ تعلیمی ادارے کھولنے کی اور مفت تعلیم دینے کی اشد ضرورت تھی لیکن حکمرانوں نے اس جانب کوئی توجہ نہ دی۔ مہاجرین اس غرض سے پاکستان آئے تھے کہ ان کے حالات بدل جائیں گئے۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ان کو یہ اندازہ ہونے لگا کہ اس ملک کے اندر بھی ان کے لیے کچھ

نہیں رکھا تو وہ اس سے بہت مایوس ہوئے۔

نشاط فاطمہ نے افسانہ "بھر بھری رات کا طوفان" میں مرکزی کردار "نورن" کے ذریعے تعلیمی پسماندگی کو اُجاگر کیا۔ "نورن" کے دل میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اور پیسے کمانے کی خواہش کو اُجاگر کیا۔ تعلیم اور پیسے کی ضرورت پاکستان بننے کے بعد اشد تھی۔ لیکن اس جانب کسی نے توجہ مرکوز نہ کی۔ ہندوؤں کی سوچ تھی کہ مسلمان بچوں اور نوجوانوں کے حالات کبھی نہیں بدلنے چاہیئے۔ ان کو گھر سے ایک بار پھر دربدر کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کو عرب چلا جانا چاہیئے یا کسی دوسرے ملک میں رہائش اختیار کر لینی چاہیئے:

> "کچی بستی میں بھی لوگ اکثر کہتے تھے کہ عرب جانے میں فائدہ ہے کاش میں جا سکتی۔۔۔ قاعدہ بستہ اور سکول کا خیال تڑپانے لگا۔"(۱۹)

افسانہ "بھر بھری رات کا طوفان" میں تعلیمی میدان اور اقتصادی میدان میں پاکستان کی پسماندگی کی بڑی وجہ غلط منصوبہ بندی کو قرار دیا۔ قومی دولت کا زیادہ تر حصّہ پاکستان کے غریب عوام پر خرچ کرنے کی بجائے کارخانے وغیرہ بنانے پر لگا دیا گیا۔ کاریگر اور مزدور کسی بھی پیشے سے منسلک نہ ہو سکے۔ جس کی وجہ سے ملک میں اقتصادی بحران پیدا ہوا اس طرح سے پاکستان اقتصادی اور تعلیمی میدان سے محروم ہوا۔ بنگالیوں کی حالت زار قیام پاکستان کے بعد بہتر تو ضرور ہوئی مگر مشرقی پاکستان کے لوگوں کا معیار زندگی بہتر نہ ہو سکا۔ بنگالیوں کے معاشی حالات مغربی پاکستان کے لوگوں سے مختلف تھے۔ اس قدر اقتصادی تفاوت نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کی زندگیوں پر بہت برے اثرات مرتب کیے۔ نشاط فاطمہ نے بنگالیوں کی غربت کی تصویر کو بیان کیا ہے:

> "چاروں طرف پہاڑ ایسی اٹھتی ہوئی کوٹھیاں تھیں جن میں ایسے لوگ رہتے تھے کہ اگر بستی میں کوئی دو وقت بھوکا رہے تو کبھی نہ پوچھتے تھے۔ چھدلداریوں میں کسی اوڈ کا بچہ مر گیا تو کسی نے اپنی دہلیز لانگ کر افسوس نہ کیا۔"(۲۰)

بنگالیوں نے مغربی پاکستان کی غربت اور تعلیم کی پسماندگی کی حالت زار میں بہتری دیکھی اور دوسری طرف دیکھا کہ غربت، تعلیمی پسماندگی میں پسے ہوئے بنگالی عوام فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بنگال کے عام غریب آدمی کی حالت مغربی پاکستان کے انتہائی غریب آدمی سے بدتر ہو گئی۔ اس لیے بنگالیوں کے دلوں

اندر مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکنے لگی۔ یہی معاشی اور اقتصادی بحران مشرقی پاکستان کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کا ذریعہ بنا۔ بنگالیوں کو اس بات احساس ہونے لگا کہ ان کا استحصال مغربی پاکستان کے ہاتھوں سے ہو رہا ہے۔ یہی وہ صورتحال اور حالات تھے جس کی وجہ سے سقوط ڈھاکہ کا واقعہ پیش آیا۔

پاکستان کے ان دو حصّوں کے درمیان اختلافات بنیادی طور پر لسانی حوالے سے ابھرا۔ قائداعظم نے اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دیا۔ کیوں کہ ان کے خیال میں اردو زبان ہی پاکستان کے ہر خطے میں یکجہتی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ مگر قائداعظم کے اعلان کے بعد مشرقی پاکستان کے لوگوں کو ہندوؤں نے گمراہ کن تاثر دینا شروع کیا کہ بنگالیوں کو ان کی زبان سے محروم کر کے مغربی پاکستان والے ان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ اس غلط فہمی کی بدولت مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں کے اندر نفرت کی ہوا مزید بڑھنے لگی۔

نشاط فاطمہ نے افسانوں کے اندر لسانی مسئلے کو بھی احاطہ تحریر میں لایا ہے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لوگوں کی زبان الگ ہونے کی وجہ سے لسانی اور گروہی تعصب ابھر کر سامنے آیا۔ سقوط ڈھاکہ سے پہلے مشرق اور مغرب کے اندر صورتحال کی کشیدگی کا باعث زبان بنی:

> "اسماعیل خان بڑی عجیب و غریب زبان بولتے تھے۔ جب وہ لاہور میں رہتے تو چترالی اردو اور بنگالی بیک وقت اکٹھا بولتے۔ لیکن جب افغانستان سے آتے تو ان کی بولی میں پشتو اور فارسی الفاظ کی بھرمار ہوتی۔۔۔ چناچہ یہ ہنگامہ اپنی آب و تاب سے اتوار کے اتوار ہوتا رہا۔"(۲۱)

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں سب سے اہم مسئلہ زبان کا رہا ہے۔ بنگالی چاہتے تھے کہ بنگالی زبان کو ملک کے اندر سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اور اسی زبان کو ملک کے اندر فروغ دیا جائے۔ مغربی پاکستان کے لوگ اردو زبان کو سرکاری زبان کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اس اختلاف کی بدولت ملک کے لوگ دو حصّوں میں بٹ گئے جس کی بدولت آنے والے دنوں میں مسائل کم ہونے کی بجائے بڑھتے گئے۔

ب) ہجرت کے واقعات

سقوط ڈھاکہ اور ہجرت ایک اہم موضوع ہے۔ نشاط فاطمہ نے بلاواسطہ اور بلواسطہ اس موضوع کی عکاسی افسانے "گم کردہ رہِ منزل"، انسان کی تلاش"، "مزدور"، "آج کے غم کے نام"، "ایک ساعت"، "دل گرفتہ لوگ"، کرپان ہلکی ہو گئی"، "وقت کی صلیب" اور "وقت فتنہ گر" میں کی ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت خوف اور دہشت کی فضا نے پورے ماحول اور انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ زندگی کا گوشہ گوشہ ملک کے دو ٹکرے ہو جانے کی وجہ سے متاثر ہوا۔ لوگ جسمانی، نفسیاتی، ذہنی اور فکری سطح پر جنونی اور وحشی ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے وسیع پیمانے پر مالی اور جانی نقصان ہوا۔

سقوط ڈھاکہ کی وجہ سے کوئی ذی روح محفوظ نہ رہ سکا۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لکھاریوں نے خون آلود یادیں رقم کیں۔ جب حالات بہت زیادہ سنگین ہو گئے تو کچھ خاندان اپنی عزت وناموس بچا کر مشرقی پاکستان کی جانب اور مغربی پاکستان کی جانب ہجرت کر گئے۔ کچھ لوگ گھروں میں محصور ہو کر رہ گئے۔ موت کی آہٹ ہر جانب سنائی دے رہی تھی:

> "جلاوطن ہوئے اس جرم کی پاداش میں کہ حب الوطن تھے۔ میں اس دھرتی پر دوبارہ لوٹتا ہوں لیکن عارضی طور جو آج بنگلہ دیش کہلاتی ہے۔ یہ شہر جس میں اجنبی کی طرح کھڑا ہوں۔ بنگلہ دیش کا یہ شہر ڈھاکہ ہم پر تنگ ہو گیا تھا۔ کہا گیا جب تم پر تمھارا شہر تنگ ہو جائے تو اسے چھوڑ دو۔"(۲۲)

باہمی اختلافات کی وجہ سے جب اپنوں نے ہی ایک دوسرے پر زمین تنگ کر دی تو مجبوراً لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرنا پڑی، جو بڑا تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ ڈاکٹر شفیق انجم رقمطراز ہیں:

> "اپنے گھر بار اور وطن کو چھوڑنا کبھی بھی ایک خوشگوار تجربہ نہیں رہا اور ہنگامی حالات میں تو اس کی شدت اور بھی اذیت ناک ہوتی ہے۔ تاریخی حوالوں سے ثابت ہے کہ تقسیم کے بعد چند سالوں میں کم و بیش دو کروڑ انسانوں نے ہجرت کی۔ ہجرت کے المناک واقعات تاریخ کی کتابوں میں محفوظ رہے لیکن یہ محض ایک وقتی معاملہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات برسوں باقی رہے۔"(۲۳)

جب حالات بہت زیادہ سنگین ہو گئے تو لوگوں نے برسوں کے رشتوں کو لمحہ بھر میں توڑ دیا۔ دوسری طرف لوگ اس گمان میں مبتلا تھے کہ اگر ہم اپنا الگ وطن مغربی پاکستان حاصل کر لیں گئے تو رشتوں کا احترام اور تقدس قائم رکھیں گئے۔ اگرچہ کچھ لوگ مشرقی پاکستان کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے لیکن لوگوں کی غلط فہمی اس وقت شروع ہو گئی جب فسادات کے پس منظر اغواو قتل وغارت گری شروع ہو گئی تو لوگوں کو مجبوراً وہاں سے ہجرت کرنا پڑی۔ الغرض مشرقی پاکستان کے دفاع کی پالیسی ناکام رہی۔ بھارت اور ملک دشمن عناصر اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے۔ مشرقی پاکستان کے وہ لوگ جو بنگلہ دیش کے قیام کے حق میں نہیں تھے۔ وہ لوگ بھی مجبوراً بنگلہ دیش کا حصّہ بن گئے۔ حالانکہ انھیں بھی اپنے تحفظ کا مطالبہ پورا کرانے کا حق تھا لیکن مشرقی پاکستان کے بارے میں ناکام پالیسی کی بدولت شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ میجر جنرل (ر) تجمل حسین ملک رقمطراز ہیں:

> "مغربی پاکستان میں ہمارے فوجی دستوں نے سرحدوں کے نزدیکی مقامات پر جہاں تک ممکن تھا پوزیشنیں لے لی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں ہونے والی صف آرائی پر بھی اسی طرح اطلاق ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ کوئی نو آبادی نہیں تھی، وہ بھی پاکستان کا ایک حصّہ تھا۔ اس کا ہر انچ رقبہ زمین بنگالیوں کے لئے اتنا ہی مقدس اور پیارا تھا جیسے ہمیں مغربی پاکستان کی سرزمین عزیز تھی۔ بنگالیوں کی بہت بڑی تعداد کو جو سرحدی قصبات میں رہتے تھے اور باغیوں میں شامل نہیں ہوئے گدھوں کے حوالے نہیں کیا جاسکتا تھا۔۔۔ مشرقی پاکستان کے اس حصّے کو بنگلہ دیش قائم کرنے کی خاطر انڈیا کے حوالے کر دیا گیا۔"(۲۴)

قتل وغارت گری کے اس ماحول اور یقین کی کیفیت میں مبتلا ہو کر لوگ یہاں سے اپنے بچوں کو لے کر روانہ ہو گئے۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ زیادہ تر لوگ اپنی جان کو عزیز سمجھ کر ایک محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر چلے گئے:

"اس گھر کے مقیم اپنے بچوں کو سمیٹ کر گاڑی میں بیٹھ کر دن بھر کو جا چکے تھے۔ انہوں نے جانے کی جلدی اور بچوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر گاڑی میں بٹھانے میں غالباً مجھے نہیں دیکھا۔ ورنہ وہ مجھے گھر سے نکال دیتے۔"(۲۵)

افسانے کے مرکزی کردار حالات کے سنگین ہونے کی وجہ سے اپنے بچوں کو سمیٹ کر ایک محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں نکل پڑے۔ نشاط فاطمہ نے اس افسانے میں ہجرت سے دوچار لوگوں کی عکاسی کی ہے کہ ہجرت کے دوران لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ لیکن ان کے دلوں کے اندر ایک محفوظ پناہ گاہ کی خواہش تھی۔ ہجرت کر کے چلے جانے کے بعد ہر چیز اپنی جگہ پر جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ سوائے وہاں گھروں میں رہنے والے افراد کے:

"میں ایک انسان تھا جس کے ہاتھ میں نہ تیر کمان تھا اور نہ گولی داغنے والی فولاد کی نالی۔ میں تو آشتی اور امن کا دلدادہ تھا۔ آج یہ کوٹھیاں اسی طرح کھڑی تھیں مگر ان کے مقیم بدل گئے تھے۔"(۲۶)

سقوط ڈھاکہ کے دوران مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لوگوں نے ایک دوسرے کے وجود کو دل سے تسلیم نہ کیا جس کی وجہ سے پاکستان دولخت ہوا۔ سقوط مشرقی پاکستان کے سانحے میں گھر، کوٹھیاں اور جگہ اپنی جگہ جوں کے توں قائم رہے لیکن ان گھروں میں رہنے والے مقیم کہیں بے نام ہو گئے۔ اس افسانے کے اندر بھی مرکزی کردار صرف امن چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تیر، کمان اور گولیاں کوئی ایسا ہتھیار نہیں تھا جس سے ملک کے اندر امن وامان کی کوئی خرابی ہو وہ ایک محب وطن تھا جسے پاکستان سے بڑی محبت تھی جسے اب گھر اور کوٹھیاں دیکھ کر اس میں رہنے والے لوگوں کی یاد ستاتی تھی جن کی بدولت وہاں رونق تھی۔

ہجرت کے دوران سقوط ڈھاکہ کے المناک واقعے نے کئی سوالات تاریخ کے اوراق پر ہمیشہ کے لیے نقش کر دیئے کہ اجتماعی آشوب میں گھیرے ہوئے انسان جینے کے لئے جتن کر رہے تھے۔ ظلم، نفرت کے شکار لوگ نسلی، لسانی اور صوبائی تعصب کی بنا پر ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔

"تم سے کون کہے کہ تم خواہشات کے غلام ہو۔۔۔ مجھے احساس ہوا جیسے وہ کوئی وجود نہ ہو۔ محض گزرے ہوئے کل کی صدائے بازگشت ہوں۔"(۲۷)

"وقت کی صلیب" میں اس دور کی کہانی کا آغاز ہوتا ہے کہ کس طرح انسان خواہشات میں مبتلا ہو کر اپنے خونی رشتے کو بھلا دیتے ہیں۔ اس کہانی میں سقوط ڈھاکہ کے سانحے کی عکاسی کی گئی ہے۔ افسانہ "وقت کی صلیب" میں بظاہر لوگ ایک دوسرے کے حامی وناصر ہیں لیکن شر پسند عناصر بھولے بھالے لوگوں کو ورغلا رہے تھے۔ ہجرت سے دوچار لوگوں کا وجود ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے قیامت خیز مناظر ان کے سامنے ہوں۔

سقوط ڈھاکہ کے سانحے کی وجہ سے ایسے لوگوں کی بھی عکاسی ہوئی ہے جو عبادت گاہوں میں جا کر اپنے سکون کی خاطر ماتھوں کو رگڑتے تھے۔ اللہ کے پرہیز گار اور متقی بندے تھے مگر ایسی کیفیت کا نام ونشان بھی ان کے چہروں پر نظر نہیں آیا۔ قوموں اور نسلوں کو تباہ کرنے اور ایک دوسرے سے الگ کرنے میں ایسے لوگوں میں سے بھی بعض کا ہاتھ تھا:

> "عبادت گاہوں کے لوگ سکون، یکسوئی اور طمانیت کی خاطر ماتھے رگڑتے ہیں۔۔۔ مگر ایسی کیفیت کا نام ونشان بھی اس کے ماتھے پر عیاں نہ تھا۔ وہ تو جیسے ایک بیکار روح تھی جو وقت کے ساتھ بھٹک رہی تھی۔"(۲۸)

سقوط ڈھاکہ کے دوران لوگ روحانی طور پر بے اطمینانی کا شکار تھے۔ یہ صورتحال اس قدر المناک تھی کہ اس دوران عبادت گاہوں کے اندر عبادت کرنے کا بھی پُر سکون ماحول میسر نہیں تھا۔ لوگ پُر سکون ہو کر عبادت نہیں کر سکتے۔ الغرض روحانی سطح پر بھی لوگوں پر خارجی اثرات کے آثار تھے جس نے ان کو داخلی سطح پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار کر دیا تھا۔

فرقہ ورانہ تعصب اور کشت وخون کے المناک واقعات ہجرت کے دوران پیش آئے جن کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ خدا کی طرف سے جو موت آتی ہے وہ بھی انسان برداشت کر لیتا ہے کیونکہ وہ انسان کم از کم اسی خاک پر دفن تو ہوتا ہے۔ یاد آنے پر پھولوں کا گلدستہ لے کر انسان ملاقات کے لیے پہنچ جاتا ہے لیکن ہجرت کر کے جانے والوں کی جدائی برداشت کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں نے سوچا تھا کہ اب امن وسکون کی زندگی بسر کریں گئے۔ لیکن یہ محض ان کا خواب وخیال تھا۔ آزادی کے بعد دوبارہ ہجرت اور فسادات کا سامنا ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ اس افسانے کی مرکزی کردار جو اپنے شوہر کے مر جانے پر بھی اتنی نہیں

روئی تھی جتنا اپنے بچوں کے ہجرت کر جانے پر روئی۔ ہجرت کے نتیجے میں ظلم کی سب سے مشکل صورت حال یہ تھی کہ ہجرت کے دوران ماں اپنے بچوں سے بچھڑ گئی۔ بچے ہجرت کر کے چلے گئے اور ماں ادھر ہی رہ گئی۔ جس کی وجہ سے وہ ایک ذہنی صدمے کا شکار ہو گئی۔

"نہیں اس لیے کہ انھوں نے ترک وطن نہیں کیا تھا۔ وہ اسی خاک پر دفن ہیں جو وطن کہلاتی ہے۔ جب مجھے ان کی یاد آتی ہے تو میں ان کی پسند کے پھولوں کا گلاستہ ان کی قبر پر رکھ آتی ہوں۔ لیکن بچوں کے جانے کے بعد میں اس لیے روئی کہ وہ ہجرت کر کے چلے گئے۔ جدائی موت سے زیادہ شاق گزرتی ہے۔ جب زمین سے رشتے۔۔۔ ٹوٹتے ہیں تو انسان کی ذات بھی ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے۔ اس کی حالت اس کشتی کی سی ہو جاتی ہے۔ جس کا دار و مدار موجوں پر ہو۔"(۲۹)

نشاط فاطمہ نے سقوط ڈھاکہ کے سانحے میں سیاسی اور سماجی مسائل کی نشاندی کی ہے۔ تقسیم ہونے کے بعد ان سے بچھڑ جانے والی عورت نفسیاتی کشمکش کا شکار ہو گئی۔ جس کے خاندان کے کچھ افراد مشرقی پاکستان چلے گئے اور وہ خود مغربی پاکستان رہ گئی۔ نشاط فاطمہ کا شمار ایسی خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے ہجرت کے مناظر براہ راست دیکھے کہ موت سے زیادہ اپنوں سے جدائی کا دکھ انسان کو جیتے جی مار دیتا ہے۔ اور اسی کی عکاسی انہوں نے افسانے کے مرکزی کردار کے ذریعے کی ہے کہ جو اپنے شوہر کے مر جانے پر اتنی غمزدہ نہیں ہوتی جتنا اپنے بچوں کے ہجرت کی بنا پر افسردہ اور غمزدہ ہوتی ہے۔

ہندوستان کی تقسیم ایک نا قابل تردید حقیقت تھی۔ ذہنی طور پر یہ تقسیم بہت سے گھرانوں کے لیے نا قابل قبول تھی۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے پس پردہ عناصر میں اقتصادی طور پر مشرقی پاکستان کا پسماندہ ہونا بھی ہے۔ مشرقی پاکستان میں لوگ اقتصادی پسماندگی کی وجہ سے بھی احساس کمتری کا شکار ہوئے۔ بعد میں یہی احساس کمتری نفرت کا باعث بنی۔ نشاط فاطمہ نے افسانے "کرپان ہلکی ہو گئی" میں ایسے لوگوں کی بھی عکاسی کی ہے جنہوں نے غربت سے تنگ آکر ایک ملک کو چھوڑا اور دوسرے ملک ہجرت کر گئے۔ غربت کی وجہ سے آئے روز ان لوگوں کا معیار زندگی پسماندہ ہوتا رہا۔ ان کی مشکلات کم ہونے کے بجائے دن بدن بڑھنا شروع ہو گئیں:

"حکومت بہت زیاتیاں کر رہی ہے۔۔۔ جسے دیکھو گھر بار چھوڑ کر دیش سے باہر بھاگا جا رہا ہے۔۔۔ اس دیش کی ساری کل غریبی ہے۔ ہم سب ہی دوسرے دیش والوں کے مقابلے میں غریب ہیں۔"(۳۰)

حقیقی زندگی میں بہت سے لوگ پاکستان میں شامل تو ہو گئے لیکن ان کے ذہن میں دکھوں اور تلخ یادوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ جن لوگوں کی عصمتیں اور گھر بار سب لٹ گئے تھے۔ وہ قیام پاکستان کے بعد ایک خوشحال زندگی گزارنے کے خواہاں تھے لیکن جب ان کا معیار زندگی ان کی توقعات کے مطابق نہ گزرا تو انہیں سخت مایوسی اور پریشانی ہوئی۔ مجبوراً وہ اس ملک کو چھوڑ کر مشرقی پاکستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ نشاط فاطمہ نے پاکستان کو درپیش مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے جذباتیت اور ہجرت کے تکلیف دہ لمحات کے ساتھ ساتھ اس دور کے لوگوں کی ذہنی کیفیت کا نقشہ کھنچا ہے۔ یہ نقشہ کہیں اشاروں کی صورت میں اور کہیں براہ راست کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ افسانہ "مزدور" کے اندر نشاط فاطمہ نے گھر سے بے گھر ہونے کی صورتحال کی عکاسی کی ہے۔ یہی وہ لوگ تھے جو زبان، مذہب اور دیگر اختلافات کو بالا طاق رکھ کر آپس میں الجھ گئے۔ اس کی عکاسی نشاط فاطمہ نے یوں کی ہے:

"اور آخر آپ کیوں چاہتے ہیں کہ سب گھر بار چھوڑ کر ایک نئے ملک میں جا بسیں اور گھر سے بے گھر ہوں"(۳۱)

گھر سے بے گھر ہونے کا سفر انسان کے لیے کافی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ آبائی مٹی سے اس کے اور اس کے آباؤاجداد کی یادیں جڑی ہوئے ہوتیں ہیں۔ اس مٹی کی خوشبو انسان مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔ نشاط فاطمہ نے افسانہ "مزدور" میں اسی دکھ اور تکلیف کو بیان کیا ہے کہ ہجرت کے دوران جب معاشی پسماندگی سے تنگ آکر لوگوں نے اپنی مٹی اور زمین کو خیر آباد کہنے کا فیصلہ کیا تو اس وقت ان کی پریشانی اور دکھ اس سے بڑھ کر اور کسی چیز میں اتنا نہیں تھا جتنا انہیں اپنی زمین اور اس سے جڑی یادوں کو چھوڑ کر جانے پر ہو رہا تھا۔ اس دکھ نے انہیں عمر بھر کہر میں مبتلا رکھا جس سے وہ چاہا کر بھی نہیں نکل سکتے تھے۔

نشاط فاطمہ نے مغربی پاکستان میں کئی سال قیام کیا۔ انہوں نے اپنے قیام کے دوران ہونے والی تباہ

کاریوں کا بغور مشاہدہ کیا اور اپنے افسانوں کے اندر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی تباہ کاریوں اور استحصالی رویوں کو موضوع بنایا۔ جب حالات بہت سنگین ہو گئے تو لوگ اپنی قائم مقام جگہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد پسنے والے لوگ جو اپنی ایک معمول کی زندگی کی جانب رواں دواں تھے وہ باہمی اختلافات کی بنا پر یہ جگہ بھی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ سقوط ڈھاکہ کے سانحے کے وقت لوگ جوق در جوق ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرنے لگے۔ افسانہ "آج کے غم کے نام" میں نشاط فاطمہ اُن حالات کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ افسانے کی مرکزی کردار حالات اور واقعات کی صورتحال کی وجہ سے ہجرت کرنے کو خود تیار تھیں مگر ان کا بیٹا اپنے اس علاقے کو چھوڑ کر ان کے ساتھ نہیں جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو بہت سمجھایا کہ بیٹا یہاں رکھا ہی کیا ہے اور یہ بھی سمجھایا کہ اگر حالات بہت خراب ہو جائیں تو وطن کو بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ اس کی عکاسی نشاط فاطمہ نے یوں کی ہے:

> "یہ میرا دیس ہے۔ میں اتنا بڑا نہیں ہوا ہوں۔ ہاں یہاں رکھا تو کچھ نہیں ہے سوائے ہرے بھرے جنگلوں اور دکھ کے دکھ جو غریب کا تلخ پھل ہے۔۔۔ یہاں کے حالات خراب ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ اگر حالات خراب ہوں تو وطن کو چھوڑ دینا چاہیئے"(۳۲)

دیس اور وطن سے محبت ایک ایسی محبت ہے جو لازوال محبت ہے۔ یہ محبت ہی انسان کو اس وطن کے لیے جانی اور مالی قربانی کے لیے تیار کرتی ہے اور اس محبت کی وجہ سے وہ وطن پر جان تک نچھاور کر دیتا ہے۔ معاشی پسماندگی کی وجہ سے لوگ اس وطن کے اندر محنت مزدوری کرتے رہتے ہیں اور ہر طرح کے دکھ اور پریشانیاں برداشت کرتے رہتے ہیں۔ مگر جب وطن کی زمین ان پر تنگ کر دی جائے اور آئے روز ان کا استحصال ہو تو مجبوراً پھر اُن کو اس وطن کو خیر آباد کہنا پڑتا ہے جو ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ ملک کو دولخت کرنے میں ایک طرف پس پردہ کئی سازشی عناصر شامل تھے جس کی بدولت ملک کے حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ ملک کے اندر مایوسی اور افراتفری پھیل گئی اور دوسری طرف ملک کے حکمرانوں کا بھی ملک کی تباہی میں کسی نہ کسی طرح حصّہ تھا۔

سلیم منصور خالد رقمطراز ہیں:

"یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کسی مقبول عوامی تحریک آزادی کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مشرقی پاکستان کے عام لوگ علیحدگی چاہتے تھے۔ اسی طرح اس سانحے کو محض صدر جنرل یحییٰ خان کی حماقتوں اور مسٹر بھٹو کی سازشوں یا صرف بھارت، روس اور امریکہ کے منصوبوں سے وابستہ کر دینا یک رخے مطالعہ کے مترادف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس المیہ کے ڈراپ سین کے وقت اسٹیج پر یہی کردار موجود تھے لیکن اس کہانی کی ڈرامائی تشکیل اور اس کے اسٹیج کی تیاری میں ہمارے حکمرانوں اور طالع آزما سیاستدانوں نے بقدر توفیق حصّہ لیا۔"(۳۳)

فسادات کے نتیجے میں جہاں بہت سے افراد لقمہ اجل بنے وہاں بہت سے افراد پر جبری ہجرت مسلط کر دی گئی۔ ایک دوسرے کی زندگیوں کے ساتھ خون کی ہولی کھیلی گئی۔ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی جان بچا کر ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بہت سے لوگوں نے قافلوں کی صورت میں پیدل ہجرت کی۔ دراصل قیام پاکستان کے بعد سے ہی پاکستان سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل میں گھیرا ہوا تھا۔ دوسری طرف ۱۹۶۵ء تک کے حالات نے جو مسائل پیدا کیے اس سے پاکستان قوم ابھی تک سنبھلی تھی۔ ۱۹۷۱ء تک لوگوں میں قنوطیت، افسردگی اور مایوسی کے بادل گہرے ہو چکے تھے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ نے نئے مسائل کو جنم دیا ہجرت کے مسائل دوبارہ سے پیدا ہوئے۔ عوام، جبر، انتشار اور ذہنی کرب میں مبتلا ہو گئے۔

"وہ ۱۹۷۱ء کے بعد سے شدید ڈپریشن میں پڑ گیا تھا۔ بہت سوچنے لگا تھا۔ انسان دھان کے کھیت کی طرح کٹ گیا تھا۔ تب بھی ملک نہ بچ سکا اور جیسے ایک سفاک سرجن نے جسم کا ایک حصّہ کاٹ کر پھینک دیا ہو۔ اس لیے کہ وہ بیمار تھا لیکن لاعلاج نہ تھا۔ پھر علاج کیوں نہ کیا گیا۔"(۳۴)

سقوط ڈھاکہ کا سانحہ تاریخ پاکستان میں ایک تلخ حقیقت تھا۔ مسلمانوں نے بڑی جدوجہد کے بعد اپنا ملک حاصل کیا۔ مگر اس ملک کے قیام کے بعد لوگوں کو اس ملک سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ اس وجہ سے لوگوں کے اندر سخت مایوسی اور پریشانی پھیلی وہ ناامید نظر آنے لگے۔ اس وقت لوگوں میں پھیلی مایوسی اور ان کی تکلیف کو بیٹھ کر حل کیا جا سکتا تھا۔ اس کے مسائل کو حل کرنے پر بات چیت کی جا سکتی

تھی۔ باہمی اتحاد واتفاق سے معاملات طے پائے جاسکتے تھے۔ مگر ان سارے امور کے باوجود اس ملک کو دولخت کر دیا گیا۔ جس سے دونوں طرف رہنے والے باشندوں کو ایک نئی ہجرت کی تکلیف برداشت کرنا پڑی جس نے بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طرح سے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس سے ان کی مشکلات بہت زیادہ بڑھتی چلی گئیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقمطراز ہیں:

> "۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے المیہ سے دونوں کے عمل ورد عمل سے پیدا شدہ حالات ومسائل کا ذکر اس دور کی افسانہ نگاری سے ملتا ہے۔۔۔سیاسی بے صبری خانماں، بربادی اور کربو ندامت کے احساس کا پیکر بن کر ہمارے افسانوں میں رونما ہوا ہے۔"(۳۵)

قیام پاکستان کے بعد عوامی تشخص کا مسئلہ ابھر کر سامنے آیا۔ملک کے اندر منفی اخلاقیات کی فضا، چور بازاری، منافقت، دھوکہ دہی اور جھوٹ وغیرہ کا بازار گرم رہا جس کی وجہ سے ملک کے اندرافراتفری کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ نشاط فاطمہ نے افسانہ "دل گرفتہ لوگ" میں ایسے خاندان کی عکاسی کی ہے جو ۱۹۴۷ء کے فسادات کے وقت اپنی کوٹھیاں چھوڑ کر لندن چلا گیا تھا۔ انہوں نے صرف اس غرض سے ہجرت کی تھی کہ امن وامان ہونے کے بعد وہ دوبارہ اپنے ملک لوٹ آئیں گئے لیکن جب وہ واپس آئے تو اس وقت ملکی صورتحال ان کی سوچ کے برعکس تھی۔ وہ کچھ عرصہ بنگال میں رہے لیکن مکتی باہنی کا ان کو سامنا کرنا پڑا۔ وہاں سے نکل کر سندھ کی طرف آگئے لیکن سندھ میں بھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس افسانے کے اندر نشاط فاطمہ نے اس خاندان کے ذریعے دوسری ہجرت کے المیے کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب انسان کو بار بار اپنی جگہ اور مقام کو مجبوراً چھوڑنا پڑ جائے تو وہ عدم تشخص میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ آخر ہماری پہچان کیا ہے۔

سقوط ڈھاکہ کا حادثہ، ہجرت اور قومی تشخص جیسے سوالات اور امرانہ نظام کے خلاف مذمت جیسے موضوعات کو نشاط فاطمہ نے اپنے دامن میں سمیٹا اور افسانہ "دل گرفتہ لوگ" میں اس خاندان اور اس کی مشکلات کو یوں بیان کیا ہیں:

"کبھی کبھی ہمارا دل چاہتا ہے۔۔۔ آپ ہمارے مطلق کچھ بھی تو نہیں جانتیں۔ ہم ان بد نصیب لوگوں میں جو مشرقی پنجاب میں اپنی آٹھ کنال کوٹھی چھوڑ کر سنتالیس کے فسادات میں کچھ دن لندن چلے گئے تھے۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ جب امن ہو جائے گا تو واپس چلے جائیں گئے۔ مگر جب ایسا نہ ہوا تو ہم بنگال میں بس گئے۔"(۳۶)

قیام پاکستان سے سقوط ڈھاکہ تک کے سفر کے حوالے سے نشاط فاطمہ نے اپنے افسانے کے اندر حکمرانوں کی نااہلی اور غلطیوں کے ساتھ ساتھ مختلف خاندانوں کی حالت زار سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ اس افسانے کے اندر سقوط ڈھاکہ کا المیہ، عدم شناخت کا مسئلہ اور صنعتی ترقی سے پیدا شدہ مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ وقتی طور پر ہنگامی نوعیت کی بدولت ہجرت کرنے والا یہ خاندان افسردگی کی کیفیت سے دوچار ہو گیا۔ اس کیفیت نے نشاط فاطمہ کو ذہنی طور پر بہت متاثر کیا اور اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ نشاط فاطمہ افسانہ "ایک ساعت" میں سقوط ڈھاکہ کے المیے کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ افسانہ مشرقی پاکستان سے قبل کے حالات پر مبنی ہے کہ کس طرح لوگ ایک ساتھ رہتے ہوئے الگ ہونے کی جستجو میں محو ہو گئے:

"صدیوں پرانی آواز جو دھیمی اور کمزور تھی۔ شہر کی فصیلوں میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ تب مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہم سب پر شہر کی دیواریں گر پڑیں گئی اور ہم ان تلے دب جائیں گئے۔۔۔ جہاں دیکھو جدھر دیکھو یہی سلسلہ ہے کہ لڑکے باہر جا رہے ہیں گھر ویران اور سنسان ہوئے جا رہے ہیں۔"(۳۷)

افراتفری کے دور میں گھر کے گھر سنسان ہوتے جا رہے تھے۔ لوگ اپنی جانوں کو محفوظ کرنے کے لیے بہت سی جگہوں کو ویران کرتے جا رہے تھے۔ لوگوں کے دلوں کے اندر دراڑیں پیدا ہو چکی تھیں۔ عدم تحفظ کا احساس لوگوں کو ایک دوسرے سے دور کرتا جا رہا تھا۔ جب مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان دور ہو گیا تو مغربی پاکستان والوں کے لیے ایک نفرت کا احساس بھی بڑھ گیا۔ جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے لوگوں نے مغربی پاکستان کے لوگوں خیر آباد کہہ دیا۔

افسانہ "یادوں کے جلتے بجھتے دیے" میں نشاط فاطمہ ہجرت سے دوچار لوگوں کے حالات و واقعات کو بیان کرتی ہیں کہ کس تیز رفتاری سے قیام پاکستان کے بعد یہاں کے حالات بدلے۔ حالات آہستہ آہستہ ایسی

صورتحال پیدا کر رہے تھے کہ غیر بنگالیوں کا مشرقی پاکستان میں رہنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اس افسانے میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لوگوں کے درمیان اختلافات کا ذکر کیا گیا ہے۔ افسانے میں مرکزی کردار جو اپنے وطن واپس آنا چاہتا تھا:

"وہ بڑے صابر اور شاکر لوگ تھے۔ ایسا رفو گھر بھی تھا بھلا سا نام تھا، اس عقل بٹ پُرعزم، ڈوگرہ ظلم کے خلاف مجسم خاموش احتجاج وہ وطن ہمیشہ واپس جانا چاہتا تھا مگر آزادی کی کوئی تحریک سرگرم ہونے کی صورت میں وطن کی جدائی اسے بہت بے قرار رکھتی وہ بڑے کرب میں وقت گزر رہا تھا"(۳۸)

نشاط فاطمہ افسانہ "وقت فتنہ گر" میں زبان کے مسئلے پر پیدا ہونے والے اختلافات کو بیان کرتی ہیں۔ اس افسانے میں لوگوں کی تقسیم معاشی، لسانی اور علاقائی مسئلوں کی بنیاد پر نظر آتی ہے۔ ان میں سے اکثر نے اپنی اولادوں کو بنگالی زبان کا ایک لفظ بھی سیکھنے نہیں دیا۔ اس حوالے سے افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"اسی طرح ہم میں سے بہت سے لوگ کلیتاً اردو بولنے لگے۔ مگر ہمارا گھرانہ اپنی مقدرت بھر زبان سنبھالے رہا اور روایات برقرار رکھیں۔۔۔ اپنی اولاد کی زبان پر بنگالی کا کوئی لفظ آنے نہ دیا اور کبھی خاندان کے کسی فرد کی بنگالیوں میں شادی نہ ہونے دی۔"(۳۹)

سب نے مل کر پاکستان کی خاطر قربانیاں دیں مگر کچھ ہی عرصے کے بعد سب بنگالی اور غیر بنگالی خانوں میں بٹ چکے تھے۔ افسانے کا مرکزی کردار حالات خراب ہونے کی وجہ سے کراچی چلا گیا۔ مرکزی کردار کو کراچی سفر کے دوران بہت سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حالات اتنے خراب ہو گئے کہ ملک دو حصّوں میں بٹ کر بنگلہ دیش بن گیا۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد بھی ملک کے اندر امن و امان قائم نہ ہو سکا:

"ہمیں خبر بھی نہ ہوئی اندر ہی اندر سازشیں ہو رہی تھیں۔ آزاد بنگلو بھومی کی تیاریاں تھیں۔۔۔ پاکستان کے اس سرسبز حصّے میں یک لخت بادِ گرم چلنے لگی پس اتنا کہہ سکتا ہوں جب جھلسنے لگے تو ہم کراچی چل دیئے۔ اتنا سفر آسان نہ تھا مگر تفصیل بتانا اس سے بھی مشکل لگتی ہے ہم کراچی پہنچے تو وہاں بنگلہ دیش بن گیا۔ اب یہ بنگلہ دیش کے بھی ٹکڑے کرنے کا سوچ رہے ہیں۔"(۴۰)

پاکستان کا سر سبز حصّہ جب دو حصّوں میں بھٹکنے لگا تو افسانے کا مرکزی کردار کراچی آ گیا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوسری جگہ ہجرت کرنا ہے۔ یہ وہی لوگ تھے جو اب بنگالی اور غیر بنگالیوں کے خانوں میں تقسیم ہو چکے تھے:

"شاعری قوموں کے تشخص میں بڑا کردار ادا کرتی ہے۔۔۔ کراچی ڈھاکہ ہر جگہ باد گرم چل رہی تھیں میں اب یہاں سے کہاں جاؤں گا؟۔۔۔ ایک قافلہ اودھ سے چلا سفر در سفر اسے در پیش رہا۔ پیر تھمتے رہے منزل آتی نہیں"(۴۱)

مسلمانوں کو آپس میں لڑائی جھگڑوں اور داخلی کمزوریوں میں بانٹ کر شکست سے دوچار کیا گیا۔ مسلمانوں نے تاریخ دہرائے جانے کے باوجود بھی کوئی سبق نہیں سیکھا اور ہمیشہ اپنی حماقتوں کا نتیجہ برداشت کرتے رہے۔ سقوط ڈھاکہ کے موقع پر ظلم و بربریت کی تاریخ دہرائی گئی جو ۱۹۴۷ء کے موقع پر بھی ہجرت کے دوران پیش آئی تھی۔ دوہری ہجرت سے دوچار لوگ اس کرب میں مبتلا رہے کہ اگر یہاں سے نکالے گئے تو کدھر جائیں گئے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھی یہ کرب بالخصوص مشرقی پاکستانیوں کے جذبہ و احساس کو شدید متاثر کرنے کا باعث بنا۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ یہاں پر ان کو ہجرت کرنا پڑی لیکن پھر بھی ان کو اپنی اصل منزل نہ مل سکی۔ محمد عبد الخالق رقمطراز ہیں:

"مشرقی بنگال غیر منقسم ہندوستان کا سب سے زیادہ نظر انداز کردہ علاقہ تھا۔۔۔ صدیوں کی بے اتفاقی کے بعد قیام پاکستان کی بنا پر مشرقی بنگال کو اہمیت حاصل ہوئی ہے اور ملک کے معاشی امکانات کا اندازہ لوگوں کو پیدا ہوا۔"(۴۲)

مشرقی بنگال کے لوگوں نے عرصہ دراز سے محرومیت کی زندگی گزاری تھی۔ معاشی مشکلات کے باوجود بھی لوگ اس امید پہ جی رہے تھے کہ مستقبل میں ان کے حالات بہتر ہو جائیں گئے۔ بہت سارے لوگوں نے صبر کا دامن تھامے رکھا مگر کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو مایوسی کا شکار ہو کر ہجرت کر گئے اور اپنی مٹی اور اپنوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر آباد کر گئے۔

ج) فسادات کے واقعات

سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا تو پورے ملک کے اندر نسل کشی کی پالیسی شروع ہو گئی تھی۔ بہت سے لوگوں کو فسادات کے نتیجے میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور جو بچ گئے وہ عزت و آبرو اور اپنا وجود سب کچھ خطرے میں ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ نشاط فاطمہ نے اپنے افسانوں میں فسادات کے حوالے سے دل سوز تصویریں پیش کی ہیں۔ ان افسانوں میں فرقہ ورانہ فسادات کی عکاسی ہی نہیں کی گئی بلکہ ان میں درد اور انسانی ہمدردی، کشت وخون، بربریت کے مظاہروں اور جسمانی اذیتوں تک کے تذکرے ملتے ہیں۔ فسادات کی صورت میں ہونے والے حادثات کے انسانیت کے سمندروں پر اثرات بہت دیرپا تھے۔ تقسیم کے وقت لوگ جوق در جوق قافلوں کی صورت میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی طرف رواں دواں تھے۔

نشاط فاطمہ نے افسانے "گم کردہ رہِ منزل"، "انسان کی تلاش"، "بھر بھری ریت کا طوفان"، "وقت کی صلیب"، "کرپان ہلکی ہو گئی"، "ایک لمحہ"، "اس گھر کے مکین"، "آج کے غم کے نام" اور "وقت فتنہ گر" میں فسادات کی عکاسی کی ہیں۔ ان افسانوں میں زیادہ تر قتل وغارت گری، گھروں کے اجڑنے، انسانی رشتوں کے ٹوٹنے کے خوفناک مناظر اور انسانی بے حسی کو موضوع بنایا ہے۔ نشاط فاطمہ نے افسانہ "گم کردہ رہِ منزل" میں جہاں ایک طرف ان لوگوں کی عکاسی کی ہے جو اپنی عزتیں اور جانیں بچانے کی خاطر ہجرت پر مجبور تھے تو دوسری طرف وہ ان لوگوں کی داستان بیان کرتی ہیں جن کی لڑکیاں طوائفوں کی طرح ان فسادات میں بک رہی تھیں:

> "اس کی باتیں سن کر انیس سو اکہتر (۱۹۷۱) کی بے تماشہ فلم کا تماشہ کرنے لگا چیخیں، آہ وپکار، بھیگی بھیگی فضا میں اندھیرے کے پار بکھرتا چلا گیا۔ فلم جاری ہے چشم دیکھتی ہے کہ ایک شہر کے اسی چوراہے پر فروخت ہوتی ہوئی پانچ لڑکیاں۔ اور طرفہ یہ تھا کہ وہ خاندان غلاماں سے تعلق نہ رکھتی تھیں اور پھر بھی کوچہ وبازار میں بکتی تھیں۔"(۴۳)

لڑکیاں کسی غلام خاندان سے تعلق رکھنے والی نہ تھیں لیکن بازاروں میں طوائفوں کی طرح بک رہی تھیں۔ نشاط فاطمہ "گم کردہ رہِ منزل" میں اس طرح کی صورتحال کی منظر کشی کرتی ہیں کہ بہت سے خاندان اپنی

آنکھوں کے سامنے اپنی بیٹیوں اور عورتوں کی عزتیں لوٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔فسادات کے تناظر میں المناک واقعات نے کئی سوالات تاریخ کے اوراق پر نقش کر دیئے۔مسلمان ہونے کے باوجود بھی کسی کی عورتیں،بچے اور بزرگ محفوظ نہ رہے۔ظلم و نفرت میں پسے ہوئے یہ مسلمان آپس ہی میں ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔

فسادات اس وقت عروج پر پہنچ جاتے ہیں جب انسان کی زبان میں زہر بھر جائے۔فسادات کی وجہ سے ماحول میں اتنا تناؤ آجائے کہ ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہو جائے۔ فسادات میں لوگوں کا ایک دوسرے پر بھروسہ اور یقین اٹھ گیا تھا۔وہ ایک دوسرے سے شدید نفرت کرنے لگے:

> "وہی آہ وبکار،وہی کرب وبلا،وہی سزا وجزا سارے جانے پہچانے عذاب ہوئے کیوں نہ ہم خانہ بدوش آج یہاں تو کل وہاں۔۔۔دھائیں دھائیں ان آوازوں سے تو مجھے شدید نفرت ہو گئی۔"(۴۴)

ہجرت کے دنوں میں المناک لمحات تھے۔ہر طرف لوگ شدید غم اور تکلیف میں مبتلا تھے۔اس چیز نے ان کو داخلی اور خارجی سطح پر شدید متاثر کیا ہے۔ہجرت کی یہ دکھ بھری داستان غم اور فسادات کا منظر پیش کر رہی تھی۔انیس سو اکہتر کا یہ منظر بالکل ویسا ہی تھا جیسا انیس سو سینتالیس کے وقت ہر طرف چیخ وپکار تھی۔عورتوں کی عزتیں اسی طرح لوٹی گئیں جس طرح سے انیس سو سنتالیس کے فسادات میں لوٹی گئیں۔بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔بہت سے ایسے بچے تھے جو ظلم کا شکار ہوئے:

> "ان تڑپتے بچوں کے زخموں کی کون چارہ گری کرے گا اور ان کے ننھے دلوں پر تسلی کے مرحم کے پھاہے کون رکھے گا۔کون کس سے کیا پوچھے کوئی کیا جواب دے۔یہ نفرتوں کا عہد اور مصلحتوں کا دور ہے۔"(۴۵)

فسادات نے معاشرے کے ہر طبقے کو متاثر کیا۔فسادات کی زد میں مردوں اور عورتوں کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی نا قابل تلافی نقصان پہنچایا گیا۔بچوں پر بھی طرح طرح کے ظلم ڈھائے گئے۔ان بچوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔حالانکہ یہ ایسے پھول تھے جو ابھی باغ میں مکمل طور پر کھلے بھی نہیں تھے۔

ڈاکٹر خالد اشرف رقمطراز ہیں:

"مذہب کے نام پر لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ معصوم بچے جلا دیے گئے۔ بیویوں کے سہاگ اجاڑے گئے اور تنکا تنکا جوڑ کر بنائے گئے گھروں کو شعلوں کی نذر کر دیا گیا۔"(۴۶)

کم عمری میں ہی ان بچوں کو ایسے دکھوں کا سامنا کرنا پڑ گیا جس سے وہ نفسیاتی سطح پر بہت سے مسائل کا شکار ہو گئے۔ فسادات کے دوران تشدد کی وجہ سے بچوں کے اندر خوف، تشویش، ڈر اور کشمکش جیسے مسائل پیدا ہوئے۔ جس کی وجہ سے بچے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو گئے۔

سقوط ڈھاکہ کے سانحہ کے وقت بہت سی بے گناہ جانوں کا خون بہایا گیا۔ یہ وہ جانیں تھیں جنہوں نے ایک ملک حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا۔ نشاط فاطمہ ایک ایسی فنکار خاتون تھیں جنہوں نے معاشرے کی ناہمواری کو بڑی سفاکی سے دیکھا اور اپنے افسانوں کے اندر بڑی بے باقی سے بیان کیا۔ وہ خود ہجرت اور فسادات کے کرب سے گزری تھیں۔ اسی وجہ سے وہ لوگوں کے دکھوں کو محسوس کرتی تھیں افسانے کا مرکزی کردار جو بنگال میں موجود تھا اس نے خود اپنی آنکھوں سے خون کو بہتے دیکھا۔ بہت سے بے گناہ لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے:

"زندگی اس طرح ختم ہو جاتی ہے جس طرح کوئی بیکار سا شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر شے کی حرکت کے معنی ہوتے ہیں۔ تم بھی اس وقت بنگال میں تھے۔ میں نے اور تم نے کتنا خون بہتے ہوئے دیکھا اور کتنی زندگیاں ٹوٹتے۔"(۴۷)

نشاط فاطمہ نے اپنے افسانوں کے ذریعے ایسے تلخ حقائق بیان کیے ہیں کہ انسان کے اندر چھپے وحشی درندوں کو بے نقاب کر کے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان کے افسانوں کے اندر لوگوں کے مسائل، ان کے دکھ درد کی عکاسی ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں فسادات کے تناظر میں پیدا ہونے والے مسائل کو جگہ دی ہے کہ اس عہد کی زندہ تصویریں ہمارے سامنے رکھ دیں۔

ڈاکٹر فوزیہ اسلم رقمطراز ہیں:

"قیام پاکستان کے بعد خارجی مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ دی گئی لیکن باطنی مسائل پر توجہ کے لیے نہ وسائل تھے نہ فرصت۔ اس ہجرت کے موقع پر قوم کو باطنی سطح پر نئی داخلی ہم آہنگی وفنی ترتیب کی ضرورت تھی۔"(۴۸)

افسانہ "انسان کی تلاش" میں تقسیم ہند اور سقوط ڈھاکہ کے حالات سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ زمین کے اوپر انسانوں کا خون اس قدر بہایا گیا کہ زمین کی سطح بھی خون کی وجہ سے نرم ہو گئی۔ "انسان کی تلاش" میں قتل و غارت گری اور انسانیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہزاروں بے گناہ انسانوں کے خون کو ایسے بہایا گیا اور ملک کے اندر امن وامان ختم ہو گیا۔ نشاط فاطمہ نے مشرق اور مغرب کے مسلمانوں کے تصادم کی حقیقت کو کھولا:

"اور جب میں نرائن گنج کی سیلی ہوئی زمین پر شاہ بازار کے باشا میں موت کے خوف سے اندھیرے میں بیٹھی رہی اس وقت بھی مجھے اس ہاتھ کا خیال آتا رہا جس نے میری روح کی صلیب اٹھانے میں مدد کی اور وہاں بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں جن کے دینے والے کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس وقت نرائن گنج کی زمین، خون اور پانی سے نم تھی انسان انسان کو پہنچاننے سے انکار کر رہا تھا۔ مجھے کون پہنچانتا۔"(۴۹)

فسادات کے دنوں میں اس قدر ظلم وستم تھا کہ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ان فسادات کے دوران خون کی ندیاں بہتی رہیں لیکن کسی کو بھی ان فسادات کا شکار ہونے والے معصوم لوگ نظر نہ آئے اور نہ کسی کو رحم آیا۔ بلکہ ظلم وستم کی انتہا جاری رہی۔

ہجرت اور فسادات نے لوگوں کو ذہنی سطح پر تناؤ کا شکار کر دیا۔ اس دوران مردوں عورتوں اور بچوں پر ظلم ڈھائے گئے جس کے وہ مستحق نہ تھے۔ غربت اور قحط کا بھی انھیں سامنے کرنا پڑا۔ بچوں پر ظلم ہوا، عورتوں کا استحصال ہوا، عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ الغرض بے گناہ عورتوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے گئے اس چیز نے لوگوں کو داخلی سطح پر جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ ہر وقت ان فسادات اور واقعات کو آنے والی زندگی کے اندر بھی دیکھتے رہے۔ ہجرت اور فسادات کی کہانی ان کے دل و دماغ پر نقش کر گئی تھی۔ وہ چاہا کر بھی اس خون کی ہولی کو بھول نہیں سکتے تھے جو ہجرت اور فسادات کے دنوں میں رچی گئی۔ نشاط فاطمہ نے افسانے "بھر بھری

ریت کا طوفان" میں ان لوگوں کے حالات اور کیفیات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے کہ کس طرح سے اس خون کی ہولی کا رنگ ان لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہے۔ اس دور کی تمام صورتحال قارئین کے سامنے ایسی آجاتی ہیں جس طرح آنکھوں دیکھا منظر ہو۔ افسانے کی مرکزی کردار "نورن" جب دادی کے ساتھ بس سٹیشن سے اتری تو اس کی حالت اتنی بدتر تھی کہ "نورن" انسانی صورت میں پہچانی نہیں جارہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر لوگوں کو یہی محسوس ہونے لگا کہ فسادات دوبارہ شروع ہو گئے ہیں:

> "جب وہ اور اس کی دادی بس سے اتریں تو لوگوں نے چونک کر دیکھا ہے جیسے مشرقی بنگال علیٰحدہ ہی ہوا ہو اور ایک بار پھر زدگان بنگال کی یورش شروع ہو گئی ہو اکثر لوگ تو فکر مند ہوئے کہ یہ بلا پھر نازل ہو گئی۔"(۵۰)

درج بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں کے اندر خوف وہراس رچ بس گیا تھا۔ ہر کوئی اس کشمکش میں مبتلا رہتا ہے کہ دوبارہ پھر قحط نہ پڑ جائے۔

سقوط ڈھاکہ کی ایک اہم وجہ حکمرانوں کی نااہلی تھی۔ ملک کے مختلف عناصر اپنے ہی ملک کے خلاف نئی سازشیں کر رہے تھے۔ قوم کو انتہا پسند بنانے کے لیے کوئی کثر نہیں چھوڑی جارہی تھی۔ ملک دشمن عناصر تفرقہ بازی پھیلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ کا امیج بگڑتا جارہا تھا۔ مسلمانوں کو پکڑ کر تشدد کیا جانے لگا۔ تشدد کے واقعات کم ہونے بجائے کی آئے روز بڑھتے جارہے تھے۔ یوں آپس کے اتحاد کو ختم کیا جانے لگا تھا۔ ملک کو دولخت کرنے کا جال بچھایا جارہا تھا۔ اس ساری صورتحال کے دوران ملک کے حکمرانوں نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ اس ساری صورتحال کی عکاسی اپنے افسانے "وقت کی صلیب" میں نظر آتی ہے کہ کس طرح قیادت کی نااہلی اور لاپرواہی سے ملک کے حالات اس قدر بگڑ گئے تھے کہ سقوطِ ڈھاکہ کا واقعہ عملی طور پر ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔ لیکن ہمارے حکمرانوں کی آنکھوں میں یہی دھول تھی کہ وہ دیکھے کو ان بھی ان دیکھا کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ سقوط ڈھاکہ کے دوران ملک میں افراتفری پیدا ہو گئی تھی اور ہر طرف قبرستان کی طرح خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ اس وقت ملک کے اندر گولہ بارود کی آوازیں شروع ہو گئیں:

"ہوا تیز ہے ہر جھونکے کے ساتھ بوچھار آتی ہے اور بھگو جاتی ہے، میرے اندر سردی کی لہر دوڑ رہی ہے مگر ایسا لگتا تھا انھوں نے ہر شے سردی، گرمی، فاقہ کشی اور تنگدستی کے خلاف IMMUNITY پیدا کرلی تھی اور ان کے CELLS ان سب سے خاموش جنگ لڑ رہے ہیں۔۔۔ قبرستان کی سی خاموشی طاری ہے۔ یکایک کسی خبر میں سے آواز آتی ہے کسی کو کچھ نظر نہیں آتا۔ صندوقوں گولہ بارود پہنچ رہا ہے۔ کسی کو کچھ نظر نہیں آتا۔"(۵۱)

ملک کے اندر حکمرانوں کی نااہلیت نے ملک کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ ملک داخلی اور خارجی سطح پر دشمن عناصر کی سازشوں کا شکار ہو گیا۔ آئے روز فسادات کی وجہ سے ملک کے حالات بگاڑنے میں بہت سے حکمرانوں کا بھی ہاتھ تھا جنہوں نے ملک دشمن عناصر کے ساتھ مل کر لوگوں کی زندگیوں کو اس قدر اجیرن بنا دیا تھا کہ وہ لوگ اپنے ہی ملک کے اندر محرومیت کا شکار ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر محمد عالم خان رقمطراز ہیں:

"قیام پاکستان کے بعد ابھرنے والے تمام رجحانات میں ایک بات جو بہت اہمیت کی حامل ہے وہ فرد کی بے بسی اور تنہائی ہے۔ جس کے نتیجے میں اسے تشخص کے بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ اسے نئی سرزمین میں پناہ نہ مل سکی۔۔۔ اسے ذہنی اور فکری جلاوطنی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔"(۵۲)

"وقت کی صلیب" ایک ایسا افسانہ ہے جو فسادات کے حوالے سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس افسانے میں بنگال کے منقطع ہونے کے بعد کی منظر کشی نظر آتی ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ تغیر پذیر ہے، حالات پر انسان کا اختیار نہ ہونے کے برابر ہے۔ انسان بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی حالات کے دھارے میں بہتا چلا جاتا ہے اور بے شناخت اور بغیر منزل کے سفر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس سے وہ اُداسی میں مبتلا ہو جاتا ہیں۔ لوگ جب نئی سرزمین میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے مرحلے میں داخل ہوئے تو اس مٹی سے وفانہ کر سکے۔ وہ مٹی سے بغاوت کے باوجود اس کی محبت میں تمام عمر پریشان اور سرگرداں نظر آئے۔ وہ ذہنی و نفسیاتی کشمکش کا شکار ہوئے۔ جب ملک دولخت ہو گیا تو مشرقی پاکستان کے سانحے کے بعد لوگوں کے دلوں سے سکون ختم ہو گیا۔ شکوک و شبہات دونوں طرف پیدا ہونے لگے۔ اس سے دربدر ہونا ان کا مقدر بن گیا۔ ان کے باطن میں

دکھ نے بسیرا کیا اور انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ فسادات کی وجہ سے بہت سی بستیاں تباہ ہو گئی۔ سیلاب کی مانند بے گناہ لوگوں کا خون بہایا گیا اور بہت سے لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر ویرانی کی جانب چلے گئے:

"اس اثنا میں تیز سے تیز بارشیں ہوئیں ۔لوگ خوب نہائے۔ بنگال ہم سے منقطع ہوا۔ قرضے کے پہاڑ کھڑے ہوئے۔ طوفان آئے۔ ہواؤں کے رخ بدلے سیلاب آئے اور بہت کچھ بہالے گئے۔ بستیاں ویران ہوئیں۔ شاہوں کے تختے الٹے، لوگوں کو گھر بار چھوڑ کر اجنبی زمینوں پر خیمہ زن ہونا پڑا۔ دل ٹوٹے، گھر اُجڑے۔"(۵۳)

سقوطِ ڈھاکہ نے زیادہ عرصے تک دونوں کو خوش نہ رکھا۔ ماضی میں کی گئی کوتائیوں سے پردہ ہٹنے لگا۔ سیاست دانوں نے بھی اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے عوام کو بہت نقصان پہنچایا جب عوام نے جذبات سے الگ ہو کر سوچا تو انھیں احساس ندامت نے گھیر لیا جو ماضی کی تلخ حقیقت سے پیدا ہوا۔ ملک کی معاشی صورتحال بھی ابتر سے ابتر ہوتی چلی گئی۔ جس سے ملک کے اندر مسائل بڑے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے حامیوں اور مخالفین کے درمیان معمولی جھڑپوں پر ہونے والے فسادات نے یک لخت دونوں طرف ایک بڑے ہنگامے کی شکل اختیار کر لی۔ قتل وغارت، خون ریزی، تشدد، عورتوں کی بے حرمتی، بچوں کے استحصال نے گلی کوچوں اور جھونپڑیوں تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ملک دشمن عناصر نے شہر کی سڑکوں پر بلاروک ٹوک ہنگامہ آرائی کی اور مساجد اور دکانوں پر بلاوجہ حملے کیے گئے۔ تشدد اور ظلم کی داستان سے پردہ ہٹانے کی کوشش کرنے والے لوگوں کو آتش زنوں نے روکا، ان کی کردار کشی کی گئی جس سے خوف زدہ خاندان شہر کے مخلوط محلے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ سقوطِ ڈھاکہ کی وجہ سے جہاں معاشرتی سطح پر تبدیلیاں رونما ہوئیں وہاں لوگوں کے ذہن بھی بری طرح متاثر ہوئے۔ لوگ اس تمام صورتحال کو صحیح طرح سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہر طرف آوازیں آہ بکا اور چیخ وپکار، دھماکوں کی آوازیں اور گولیاں چلنے کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں:

"آوازیں، آہ بکار ،چیخ وپکار، دھماکے ،بم پھٹنے کی آوازیں ،گولیاں چلنے کی سنسناہٹ"(۵۴)

فسادات کے تناظر میں چاروں جانب دھماکوں، گولیوں اور آوازوں کی چیخ وپکار تھی۔ دونوں قوموں

کے درمیان فسادات بہت سنگین صورتحال اختیار کر چکے تھے۔ فسادات کے زمانے میں فضاؤں میں صرف آہ وبکا کی آوازیں آرہی تھیں۔ فسادات وبربریت نے انسان کو اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ انسان کے سمجھنے، سوچنے اور دیکھنے تک کی صلاحیت صلب ہو چکی تھی۔ جانوروں کی طرح انسان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔

ڈاکٹر محمد ذاکر رقمطراز ہیں:

"مہذب دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال شاہد ہی ہو۔ گھر کے گھر اجڑ گئے۔ مکان جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ بے گناہ مسکین در بدر مارے پھرنے پر مجبور ہو گئے۔ سالہا سال سے فرقہ ورانہ منافرت کا کھولتا لاوا ابل پڑا۔"(۵۵)

افسانہ "کرپان ہلکی ہو گئی" ایک ایسا شاہکار افسانہ ہے جس میں فسادات کی بربریت کے دوران انسان دوستی کی کہانی ملتی ہے۔ فسادات کے دوران حالات اتنے خراب ہو رہے تھے کہ کچھ لوگ آپس میں ہی گفتگو کر رہے تھے کہ یہ کیسی آزادی ہے جس میں اپنے ہی اپنوں کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ فسادات کے دوران قافلے کے قافلے موت کی گھاٹ اُترنے لگے لیکن ان مشکل حالات کے ذمہ دار مشرق اور مغرب کے مسلمان تھے۔ مشرقی مسلمانوں کی طرف سے بھی مغربی مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ مغربی پاکستان والے بھی مشرقی پاکستان کے علاقوں پر ٹوٹ پڑے۔ فسادات کے نتیجے میں ظلم کی سب سے خوف ناک صورتحال یہ تھی کہ آزادی کے حقوق کے لیے لڑی جانے والی لڑائیوں نے امن وامان کو ختم کر دیا تھا:

"یہ کیسی آزادی ہے؟ یہ کیسی پیاس ہے؟ ہم کس سے لڑ رہے ہیں؟ لڑائیاں تو حقوق اور آزادی کے لیے ہوتی ہیں۔"(۵۶)

پاکستان میں پہلے دن سے حکومت قومی سطح پر مسائل کا شکار تھی۔ معاشی اور معاشرتی ابتر صورتحال سے غربت وافلاس زدہ افراد کی زندگیاں آئے روز بھارت اور دوسری قوتوں کی سازش کی بدولت پسماندگی کی طرف جارہی تھیں۔ قیام پاکستان کے وقت لوگوں کو فسادات کے کرب سے گزرنا پڑا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے وقت بھی ان سازشوں کی بدولت غربت اور افلاس اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ان کا جذبہ حب الوطنی اور آزادی کا تصور

بھی ویسا نہیں رہا۔ عنایت اللہ رقمطراز ہیں:

"مشرقی پاکستان کو سب سے بڑا خطرہ بھارت سے تھا جسے اچھی طرح جانتے ہوئے بھی ہم اس نظر انداز کرتے رہے۔ دوسرا خطرہ امریکہ اور روس سے تھا جسے ہمارے بادشاہوں نے کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ جب سے چین ایک عالمی طاقت بنا ہے امریکہ اور روس اس کے خلاف مورچہ بندی میں مصروف ہیں۔"(۵۷)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی ایک فوری وجہ مشرقی حصّے کے محاذ پر عسکری طور پر کمزور ہونا اور فوجی جوانوں کی مشرقی پاکستان میں نصف سے زیادہ آبادی تھی جو تینوں طرف ہندوستان میں گھیرا ہوا تھا۔ مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۰ء کے زمانے میں (۲۵) پچیس ہزار فوجی تعنیات تھے۔ حکومت پاکستان کا مشرقی پاکستان کے دفاع کے حوالے سے کہنا تھا کہ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کا دفاع کرے گا۔ جب حالات کشیدہ ہوئے تو سترہ دنوں تک مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ عسکری قوت کی کمزوری نے مشرقی پاکستان کے ساتھ ساتھ فوجی جوانوں کو شدید مسائل اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا جس نے ان کو داخلی سطح پر توڑ دیا۔ مشرقی بنگال کے محاذ پر اپنے باپ کی فوتگی پر بھی افسانے کا مرکزی کردار نہ پہنچ سکا جس سے اس کو شدید غم ہوا اور داخلی سطح پر ٹوٹ گیا:

"ابھی کمیشن ملا ہی تھا کہ اماں کا انتقال ہو گیا۔۔۔ ہمیں مشرقی بنگال کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ وہاں مجھے اطلاع ملی کہ ابا بھی ختم ہو گئے۔ معلوم نہیں یہ جنگ کیوں لڑی جاتی ہے میری چاروں طرف اتنی موت تھی لیکن اس کے باوجود میں ایک لمحہ بھی اپنے ماں باپ کی موت کے غم کی شدت کو فراموش نہ کر سکا۔"(۵۸)

مشرقی پاکستان میں بے یقینی، ڈر اور ویرانی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ ماحول میں بھی سخت تنوع تھا۔ ارد گرد بہت سی موتیں ہو رہی تھیں۔ افسانے کا مرکزی کردار اپنے ماں باپ کی موت کو فراموش نہیں کر سکا۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں ہر فرد بے چارگی اور بے بسی کی مکمل تصویر تھا۔ یہی وہ تمام حالات تھے جن کی وجہ سے سانحہ مشرقی پاکستان کے لوگ دکھ اور کرب میں مبتلا ہو گئے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں حالات کے کشیدہ ہونے کی ایک وجہ صحافیوں سے ناروا سلوک بھی تھا جس کی بدولت اس مسئلے کو میڈیا میں اجاگر

ہونے کا موقع ملا۔ یہ عالمی سازشی عناصر کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس وجہ سے بھی ملک کو نقصان پہنچا۔ وسیم شیخ رقمطراز ہیں:

"پوری جنگ کے دوران اکثر مغربی ممالک کی ہمدردیاں بنگالیوں اور ہندوستانیوں کے ساتھ تھیں۔ یہ ہماری اپنی حماقت کی وجہ سے ہوا۔ سب سے پہلی اور بڑی حماقت تو جنرل فرمان علی کے مشورے پر جنرل ٹکا خان نے یہ کی کہ اخبار نویسوں کو نہایت اہانت آمیز طریقے سے ملک سے باہر نکال دیا۔ ان صحافیوں نے مبالغہ آمیز احوال کی اشاعت شروع کر دی۔ لیکن ہماری حکومت نے اس چیلنج کا موثر مقابلہ نہ کیا۔ میں نے اخبار نویسوں سے اچھا سلوک کر کے زخم مندمل کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش آخر تک جاری رہی۔ اس حماقت کی تمام تر ذمہ داری جنرل ٹکا خان اور جنرل فرمان علی پر عائد ہوتی ہے۔"(۵۹)

مشرقی پاکستان کے لوگوں کے اندر مغربی پاکستان اور اس سے محبت کرنے والوں کے خلاف نفرت نے اس قدر جنم لیا کہ اگر وہ پاکستان سے محبت کا دم بھرتے تو بنگالی ان کو نفرت انگیز رویئے سے دیکھتے۔ عالمی سازشی عناصر کی بدولت مغربی پاکستان کی حمایت کرنے والے بھی عجیب وغریب بے چینی میں مبتلا تھے۔ اکثر بنگالیوں کے ہاتھوں مارے بھی جاتے۔ اس کے برعکس بنگالیوں کے ساتھ محبت کرنے والے پاکستانی فوج کے ہاتھوں بھی نہ بچ پاتے حالانکہ دونوں طرف رہنے والے لوگ امن وسکون اور مشکلات سے نجات کے متلاشی تھے۔ لیکن امن وسکون کا حصول ایک خواب سا نظر آنے لگا تھا:

"کہانا کہ مشرقی بنگال جو کبھی مشرقی پاکستان تھا۔ اور اب بنگلہ دیش ہے کے حالات پر حملے ہو رہے تھے۔ وہاں ہر سمے جانے کا مطلب یہی ہوا نا کہ لوگ شک وشبہ کرنے لگیں۔"(۶۰)

پاکستانی فوج نے جب مشرقی پاکستان پر طاقت کا استعمال کیا اور حالات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی تو پاکستانی فوج سے بھی کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں۔ اس سے وہ بنگالی جو متحدہ پاکستان کی بات کرتے تھے وہ بھی پاکستانی فوج سے نفرت کرنے لگے۔ بہت سارے الزامات پاک فوج پر عائد کر دیئے گئے۔ وہ لوگ جنھوں نے مسلم لیگ کی جماعت میں شامل ہو کر شانہ بشانہ تحریک میں حصّہ لیا تھا اب وہی لوگ ریاست کے دو ٹکڑے ہونے کی کھلی

حمایت کر رہے تھے۔اس صورتحال میں ان لوگوں کو خاص طور پر کئی الزامات کا سامنا کرنا پڑا جو مغربی پاکستان کی حمایت کرنے والے یا ریاست کی تقسیم کے خلاف میدان میں آئے تھے۔خاص کر مشرقی پاکستان کے اندر ایسے لوگوں کو شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھا گیا اور ان پر ایسا ظلم کیا گیا کہ جس طرح کوئی دشمن بھی نہیں کرتا۔

خود اپنے ہاتھوں سے بسائی ہوئی خوبصورت بستی سے پھر ایک نئی بستی کی طرف ہجرت ایک نیا عجیب سا تجربہ تھا۔اس خود ساختہ ہجرت کی وجہ خود غرضی، آپس میں نا اتفاقی، حکمرانوں کی عیش پرستی، ملکی وسائل کا ضیاع، مشرقی پاکستان کے لوگوں سے لاتعلقی، مغربی پاکستان کے حکمرانوں کی ہٹ دھرمی وغیرہ ایسی وجوہات تھیں جس نے ہجرت کے بعد ایک نئی ہجرت اور فسادات کے بعد نئے فسادات کی راہ ہموار کی۔شہروں کی آبادی کے دباؤ میں اضافہ تھا۔آئے روز لوگوں کو روزگار کی سہولتیں نہیں مل رہی تھیں حتی کہ اقلیتوں کے حقوق تک پامال ہو رہے تھے۔اس ساری صورتحال کی وجہ سے لوگ اذیت میں مبتلا تھے۔وہ لوگ سکون اور امن کی تلاش میں مارے مارے پھیر رہے تھے:

> "کرہ ارض پر کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ظلم نہ ہو رہا ہو اور خون نہ بہہ رہا ہو۔نمبیبیا فلسطین، کشمیر اور راوی ٹیریار، افغانستان اور جانے کہاں کہاں، خداوند تو چاہیئے تو ظلم کو بند کر سکتا ہے۔"(۶۱)

اس افسانے میں ہجرت کے موضوع اور فسادات کی وجہ سے دکھ اور تکالیف کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جان پہچان کے لیے ہجرت کرنا ایک معمولی عمل ہے۔روزگار میں اضافہ کے لیے بھی دوسرے شہروں میں ہجرت کی جاتی ہے لیکن ہجرت کے دوران ایسے فسادات اور ہنگامے جو اپنے پیاروں کو ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ کر دیں ایک بہت بڑا المیہ ہوتا ہے۔فسادات، ہنگاموں اور لڑائی کی وجہ سے دیگر پریشانیوں کی طرح یہاں کے لوگوں کی بھی مشکلات، غم اور دکھوں میں آئے روز اضافہ ہو رہا تھا۔اس ساری صورتحال کی تصویر کشی افسانے "ایک لمحہ" میں نظر آتی ہے۔

کسی بھی شے سے اس کی فطرت کے خلاف کام لیا جائے تو وہ ظلم کے زمرے میں آتی ہے۔اس سے

وہی کام لینا اس کی تخلیق کا جواز فراہم کرتا ہے۔ اپنے وجود سے ہاتھوں کا کام پاؤں سے لینا اور بازوؤں کا کام ٹانگ سے لینا بھی ظلم کے زمرے میں آتا ہے۔ یہاں تک انسان سے اس کی منشا اور اس کی مرضی کے خلاف کام لیا جائے تو وہ بھی ایک طرح سے ظلم ہی ہے۔ کسی قوم میں انتشار اور تذبذب پیدا کرنا اسے بغاوت کا رنگ دینے کے مترادف ہے۔ یہ ظلم عظیم ہے۔ ملک دشمن عناصر نے سقوطِ ڈھاکہ کے دوران پاکستان کے وجود، اس کے نظریات اور اس کے اقابرین کے خلاف بھرپور انداز میں محض آرائی شروع کر دی۔ انھوں نے بدکرداری، بدباطنی اور بدزبانی سے مظلومیت کی چادر اوڑھ کر ظلم کی انتہا کر دی جس سے ملک داخلی سطح پر بحران کا شکار ہو گیا:

> "ہر جگہ ظالم کی زبان ایک سی ہوتی ہے اور ظلم سے مختلف ایسا ہوتا کہ وہ زبان بولتے ہوئے بھی مختلف زبانیں بول رہے ہیں۔ قومیں ظلم کرتے کرتے اکثر تھم جاتی ہیں۔۔۔ مگر یہ عہد میں ظلم کا ایک نیا باب کھولتے ہیں۔"(۶۲)

پاکستان کو دولخت کرنے کے لیے زبان درازی کی گئی اور پاکستان سے محبت کرنے والے لوگوں کا جس قدر تمسخر اُڑایا گیا اس سے ظالموں کے پوشیدہ چہرے بے نقاب ہو گئے۔ مخالفت کرنے والوں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو پاگل پن سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور بعض دفعہ اس کو غیر سنجیدہ اور غیر عام سمجھا۔ آہستہ آہستہ نہ تھمنے والے ظلم سے ملک کو ایسے مقامات میں پہنچا دیا جہاں سے واپسی کا راستہ بہت مشکل تھا۔ ہر دور میں ظلم ایک نئے طریقے اور نئے انداز میں سامنے آتا ہے۔ فسادات نے ظالم اور مظلوم دونوں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ فسادات کی اس بربریت اور اذیت سے بچا جا سکا نہ ہی ظلم کرنے والا اور نہ ہی ظلم سہنے والا۔

افسانہ "ایک لمحہ" سقوطِ ڈھاکہ کے حالات کے حوالے سے ایک شاہکار افسانہ ہے۔ بظاہر شورش اتنی بڑی نہیں تھی لیکن اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ شر پسند عناصر لوگوں کو ورغلا کر حالات کو مزید خراب کر رہے تھے۔ عوام ایک دوسرے پر ڈنڈوں کی برسات کر رہی تھی۔ جلد ہی یہ ڈنڈے گالیوں میں تبدیل ہو گئے۔ اپنے پیاروں اور ہم وطنوں کی لاشیں بنگالیوں کے اشتعال کو مزید بڑھا رہی تھیں۔ ہندو بھی سازش کے تحت اس ملک کو دولخت کرنے میں ساتھ ساتھ تھے۔ عوام اور فوج کے درمیان گہری خلیج حائل ہو گئی تھی۔ غیر بنگالی اور فوجیوں

کا باہر نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔ حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ اپنی ہی فوج کے خلاف نفرت کا بازار گرم ہو چکا تھا۔ افسانے کی مرکزی کردار اپنی ماں کے ساتھ حالات کی خرابی کی وجہ سے باہر جا رہی تھی۔ اس نے سپاہی کو نفرت بھری نگاہ سے دیکھا۔ ان حالات سے وہ دلبرداشتہ ہو کر وہاں سے نکل پڑی:

> "نہ جانے وہ کب سے کھڑی آنسو بہائے جا رہی تھی۔ اس لیے بھی کہ یہ مسمار شدہ اس کا گھر تھا اور اس لیے بھی آج اس کے ارگرد بہت لوگ مرے تھے۔ پڑوس میں ننھے برٹن کی لاش اٹھائی جا رہی تھی۔۔۔ بم پھٹ رہے تھے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ آگے سنگین لیے ہوئے سپاہی کو اس نے شدید نفرت و حقارت سے دیکھا تب بھی اس نے اپنے خداوند سے شکایت کی تھی۔ تو نے ہمارا گھر کیوں اُجڑے دیا اور ننھے برٹن کو کیوں مرنے دیا۔؟"(۶۳)

بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو حساس اور محب وطن بھی تھے اور اپنے وطن سے بہت عشق کرتے تھے لیکن بم دھماکوں اور بنگال کے حالات کی خرابی کی وجہ سے مجبوراً ان کو بھی اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔

افسانہ "اس گھر کے مکین" میں ہجرت اور فسادات کے نتیجہ میں دکھ اور کرب میں مبتلا لوگوں کی کیفیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ بہت سارے لوگوں پر تشدد کیا گیا۔ احتجاج کو کچلنے کے لیے کئی محب وطن لوگوں قید وبند کی صوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ ظلم وزیادتی اور فسادات کی وجہ سے گلمرگ اور سرینگر جیسے مسلم اکثریتی علاقوں میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ مسلمانوں کے احتجاج کو کچلنے کے لیے اور ان کی آواز کو دبانے کے لیے فوج کی مدد سے جانوروں جیسا سلوک کیا گیا:

> "یہاں ہر جگہ خون ہے گلمرگ میں، سرینگر، بارہ مولاہ میں۔ مگر ایسا کیوں ہے یہ خون اب بند ہونا چاہیے۔ یہ کتنے سرسبز چمن زاروں میں پھیلے گا یہ کتنے خرمن اور پھونکیں گئے۔"(۶۴)

فسادات کے دوران بہت سارے مسلمانوں کو قید میں ڈھال کر ان پر تشدد کیا گیا۔ زخمی اور بیمار جنگی قیدیوں کو رہا کرنے کی بجائے ان پر مزید تشدد کیا گیا۔ بڑے بڑے شہروں میں خون کی ندیاں بہہ گئی۔ یہی ناروا سلوک بھارت نے پاکستان دشمن عناصر سے مل کر مشرقی پاکستان میں بھی کیا۔ مشرقی پاکستان میں بھی مسلمانوں

کے اندر غلط فہمیاں اور نفرت پیدا کرنا شروع کر دی گئی۔ اس افسانے میں سقوطِ ڈھاکہ کے دوران تشدد اور خون کی ہولی کے نتیجے میں مسلمانوں کے دکھ اور کرب کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔

مشرقی پاکستان میں فسادات کی ایک وجہ مقامی لوگوں کی معاشی مشکلات تھیں۔ اعلیٰ عہدوں پر مشرقی پاکستانیوں کا تناسب آبادی کے حوالے سے بہت کم تھا۔ قیام پاکستان کے بعد سے ہی مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں انتظامیہ کے لوگ مخلص نہیں تھے۔ وہ ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیتے تھے۔ اپنے طرز عمل اور عہدوں کے بدولت عوام کا معیار زندگی نہیں بدل سکے۔ مغربی پاکستان کے علاوہ مشرقی پاکستان میں جب اعلیٰ عہدوں پر مقامی لوگوں کے بجائے مغربی پاکستان سے افسران بھیج کر اعلیٰ عہدوں پر فائز کیے گئے تو اس سے مقامی سطح پر لوگوں کے اندر غم و غصہ زیادہ پھیلا۔ ان حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے اہم شہروں جیسا کہ کراچی، حیدر آباد، اور بنگال کے دیگر شہروں کے حالات آئے روز خراب ہوتے گئے۔

> "سندھ بالخصوص کراچی اور حیدرآباد میں منظم دہشت گردی اور بے گناہ انسانوں کے قتل وعام کو روکنے اور تخریب کاروں اور دہشت گردوں پر قابو پانے کے لیے حکومت کی تمام کوشش ناکام رہیں۔"(۶۵)

مشرقی پاکستان کے لوگ قیام پاکستان سے قبل بھی غربت اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس وقت ان کے حالات بدلنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ قیام پاکستان کے بعد بھی ملک کے بجٹ کا زیادہ تر حصّہ مشرقی پاکستان کے مقابلے میں مغربی پاکستان کے علاقوں اور آبادی میں لگایا گیا۔ اس سے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے اندر سخت مایوسی پھیلی۔ وہ چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان میں ترقی ہو اور وہاں کے لوگ انتظامی امور سنبھالیں اور مشرقی پاکستان کا بجٹ مشرقی پاکستان میں ہی خرچ ہو۔ جب انتظامی امور میں بھی مغربی پاکستان کے لوگوں کو بھیج کر اہم عہدوں پر فائز کیا گیا تو ان افسران کی نااہلی کی وجہ سے ہی مغربی پاکستان کے شہروں کے حالات خراب ہوئے۔ اس سے مشرقی پاکستان کے اندر بھی فسادات اور دہشت کا خوف پھیل گیا۔

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دونوں طرف آبادی بہت زیادہ تھی۔ مشرقی پاکستان سے بھی بہت سارے بنگالی کراچی میں تجارت اور معاش کے لیے موجود تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ سے کراچی جیسا شہر بھی متاثر ہوا

یہاں پر بھی لوگ طرح طرح کی تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ ہجرت اور فسادات نے کراچی کے امن کو بھی متاثر کیا تھا۔

"خیر تو ہے۔۔۔ بات یہ تھی کہ ہر طرف کراچی کی بہت بڑی خبریں پھیل رہی تھیں۔ دھما چوکڑی مچ رہی تھی۔ وہ اچھی سی ہنسی مذاق، پر امن فضا تقریباً ختم ہوئی جا رہی تھی"(٦٦)

مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے بنگالیوں کا کراچی کے طبقے میں اہم کردار تھا۔ سیاسی حالات آئے روز خراب ہوتے جا رہے تھے۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں رہنے والے لوگوں کے درمیان خوف وہراس پھیلا۔ اس سے کراچی کی صورتحال بھی شدید بحران سے دوچار ہو گئی۔ امن وامان کی خراب صورتحال کی وجہ سے معیشت کا پہیہ نہ صرف رک گیا بلکہ ملک کے اندر تشدد، خوف، قتل وغارت اور خون کی ہولی کا کھیل کھیلا گیا۔ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں اور مغربی پاکستان کے لوگوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دی جانے لگی۔ ملک دشمن عناصر نے ان اجتماعی مظاہروں کو ہوا دینے کے لیے بارودی دھماکوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ملک میں ان تمام مسائل کی وجہ سے صنعتی زندگی اجڑ گئی۔

ملکی اور غیر ملکی سیاسی مداخلت سے ملک کی حالت سدھرنے کے بجائے جب دن بدن بدتر ہونا شروع ہو گئی تو ایسے لگنے لگا کہ ان کا رخ پہلے سے متعین ہو چکا ہے۔ کراچی اور ڈھاکہ جیسے شہروں میں زندگی تلخ ہو چکی تھی۔ افراتفری اور فسادات کی یہ صورتحال تھی کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مشکل ہی سے کوئی دن ایسا ہو جب لوٹ مار، آتش زنی، قتل وغارت اور بارود پھٹنے کی واردات نہ ہو۔ الغرض ہلاکتوں اور لوٹ مار کا یہ سلسلہ آئے روز بڑھتا رہا۔ مقامی اور غیر ملکی رہائش پذیر لوگوں کے اندر خوف اور تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ہر آنے والا دن ایک نئی مصیبت لے کر آتا:

"یہاں رہنا صبر آزما اور جان لیوا تھا۔ ایسا لگتا کہ ہر وقت کوئی چھرے کی نوک کوئی بندوق کی نالی ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ اب کسی کو کسی پر پل کا بھروسہ نہ تھا۔"(٦٧)

ملک دشمن عناصر ڈھاکہ اور کراچی میں بس گئے۔ جوں جوں افق پر فسادات اور تشدد کے بادل گہرے ہوتے گئے توں توں بڑے شہروں سے لوگ ہجرت اور نقل مکانی کے لیے مجبور ہوتے گئے۔ شہر پسندوں کے

قبضے بڑھتے گئے۔ سرحدوں کے قریب مکتی باہنی کا کام اور بھی آسان ہو گیا جن کو بھارت کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ بھارتی توپوں کی گولہ باری کا سلسلہ مسلسل پاکستانی سرحدوں کی خلاف ورزی کر رہا تھا اس ساری صورتحال کی وجہ سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لوگ داخلی اور خارجی سطح پر شدید متاثر ہوئے۔ وسائل کی قلت پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ مادی اور نفسیاتی عناصر نے اکثر لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف ہجرت کر جائیں اور امن وامان کی زندگی گزاریں۔ نشاط فاطمہ سقوطِ ڈھاکہ سے جڑی اس کہانی کی چشم دیدہ گواہ ہیں۔ اسی دکھ درد کی کیفیت کو انھوں نے اپنے افسانہ میں اجاگر کر کے قارئین کی توجہ ان حالات وواقعات کی جانب مبذول کروائی ہے۔

نشاط فاطمہ اپنے افسانے میں سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں افراد کے مسائل اور ان کے حقوق کے دفاع کو موضوع بناتی ہیں۔ ایک حساس فنکار کی طرح انھوں نے معاشرے کی صورتحال کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ ان حقائق اور تلخ یادوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے مختلف افسانوں میں سقوطِ ڈھاکہ کی عملی تصویر نظر آتی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت ڈھاکہ کی سرزمین سے متحد ہونے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور ایک نظریاتی جنگ لڑنے کا اعلان بھی اسی سرزمین سے کیا گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ اتحاد ایسا بکھیرا کہ محبت نفرت میں بکھیر گئی۔ قربتیں دوریوں میں بدل گئیں:

> "میں نے لمحہ لمحہ پل پل لوگوں کو بدلتے دیکھا، پھولوں کو مرجھائے معصوموں کو سلگتے، حسین چہروں کو مسخ ہوتے اور شہروں کو بہت سوگوار، جہاں کبھی مایوسی نہیں ہوتی تھی، جہاں کے رنگ کبھی پھیکے نہیں پڑتے تھے۔"(۶۸)

مسلمانوں کا باہمی اتفاق آپس میں نااتفاقیوں کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے نفرتوں میں بدلنے لگا۔ حالانکہ ان ہی مسلمانوں اور ان کے آباؤاجداد نے ایک جھنڈے تلے جمع ہونے کا اعلان کیا تھا۔ ایک ہی پلیٹ فارم سے مل کر جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ ایک پلیٹ فارم کے حصول کے لیے ان کے آباؤاجداد نے جانی ومالی قربانی سے دریغ تک نہ کیا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وقت کا دھارا ایسا بدلا جس نے آپس میں اختلافات کو ایسی ہوا دی کہ یہی اتحاد نفرت میں بدل گیا۔ لوگ صوبائی اور لسانی تعصبات کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے ایک دوسرے سے دور ہو

گئے۔ نفرت کی فضا اس قدر گرم ہوئی کہ ایک ہی ملک میں لوگ آپس میں لڑ جھگڑ کر، ایک دوسرے کے گلے کاٹ کر اور ایک دوسرے کو دربدر کر کے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ نشاط فاطمہ نے اس دکھ اور کرب کی صورتحال کو اپنے افسانوں کی زینت بنایا ہے۔

وطن میں ہم وطنوں کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اگر ہم وطنوں میں باہمی اتحاد ہو، پیار محبت ہو، ایک دوسرے کا احساس ہو تو اس سے ہم وطن پر امن رہتے ہیں۔ ان کے مذہبی، معاشی اور معاشرتی حالات بہتر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو، ہم وطنوں پر ظلم ہو، انصاف نہ ہو، مظلوموں کی دادرسی نہ کی جائے، عدل کا بول بالا نہ ہو تو ایسے میں سیاسی حالات بگڑ جاتے ہیں۔ ملک عالمی سیاسی شاطرانہ چالوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ نشاط فاطمہ نے اپنے افسانے کے اندر اسی طرح کی تصویر کشی کی ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ کے دوران فسادات کی وجہ سے لوگوں میں اعتماد کی وجہ سے کمی آئی وہ ملک دشمن عناصر کی سازشوں کا شکار ہو گئے:

> "عدل کی ڈنڈی مار دا اور ظلم کی کھیتی بو اور کاٹو تم نے شب کی سیاہی میں مظلوموں کا خون ملا دیا اور اس دن کو ہم کو لمبس بنے تھے اور نئی سمیت، نئے وطن اور نئی روشنی کی تلاش میں بستی بسائی تھی۔ تو اب ہم سب مل کو کیوں رو رہے ہیں۔"(۶۹)

ملک کے باشندے ہی ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلانے کا موجب بھی یہی عناصر ہیں۔ عدل وانصاف کی فراہمی نہ ہونے کی وجہ سے اور ظلم و فسادات کی وجہ سے لوگوں کے حقوق مجروح ہو جاتے ہیں اس سے پریشانیاں بڑھتی ہیں۔ جب پاکستان کے دو ٹکڑے ہوتے ہوئے نظر آرہے تھے تو کسی نے کیوں نہ اس کو روکنے کی کوشش کی۔ جب بڑی قوتیں ہمیں کٹ پتلی بنا رہیں تھیں تو ان کے ہاتھوں میں ہمارے آدمی اور ہمارے حاکم اپنے ہی ملک کو فروخت کر رہے تھے تو اس وقت آنکھوں کو کیوں بند کر لیا گیا؟

پاکستان کا قیام ایک نظریے کی بنیاد پر ہوا۔ اس نظریے کے مطابق پاکستان کے تمام شہری بنیادی طور پر ایک ہیں۔ ہمارا طرز حیات ایک ہے اور ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا مشترکہ نظریہ حیات ہی ہمارے اتحاد کی بنیاد اور مماثلت ہے۔ اسی چیز نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے عوام کو مشترکہ بندھن میں باندھ دیا تھا لیکن

سقوطِ ڈھاکہ کے دوران یہ ساری تدابیر الٹ ہو گئیں۔ ایک ہجرت کے بعد اپنوں سے بچھڑنے والے نہ چاہتے ہوئے بھی دوسری ہجرت میں پھر اپنوں سے بچھڑ گئے۔

> "ارے کمال ہے، برلن وال ٹوٹ رہی ہے۔ اب مزہ آئے گا لوگ مشرقی برلن سے مغربی برلن اور مشرقی اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں اور پیاروں سے ملنے جائیں گئے۔"(۷۰)

فسادات کے نتیجے میں امن و سکون تباہ برباد ہو گیا۔ باہمی اتحاد ختم ہو گیا۔ معیشت کا پہیہ کمزور ہو گیا جس سے آپس میں پیدا ہونے والے جذبات بالآخر مصیبتوں کے زوال کی صورت میں ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ الغرض پاکستان کی مخصوص صورتحال اور مختلف ادوار میں دونوں صوبوں کے درمیان بڑھتی ہوئی عدم مساوات، ہجرت کا کرب، معاشی پسماندگی، آپس میں بچھڑنے کا گہرا غم، افراد کی داخلی کیفیت اور صورتحال کو اس افسانہ میں سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ امر حقیت ہے کہ دونوں صوبوں کے درمیان موجود تفریق بہت پرانی ہے۔ اس کا پس منظر تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد محدود وسائل کے ذریعے راتوں رات اس تفرئق کو دور کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں تفاوت بتدریج اس وجہ سے بڑھی۔ مختلف حکومتوں اور حکمرانوں نے اس حوالے سے غفلت کا مظاہرہ کیا۔ ایوب خان کے دور حکومت میں یہ معاملہ نہایت نازک اور پیچیدہ ہو گیا۔ مشرقی پاکستان میں کچھ قدرتی آفات کی وجہ سے بھی مغربی پاکستان سے مقابلہ کرنا مشکل ہو تھا۔ ان وجوہات نے پاکستان کو دولخت کر دیا۔ ہجرت کے بعد ایک اور ہجرت کی آزمائش سے مسلمانوں کو گزرنا پڑا۔ جو ان کے لیے بہت تکالیف دہ صورتحال تھیں۔

سقوطِ ڈھاکہ ایک ایسا سانحہ تھا جو مغربی پاکستان کے عوام پر بجلی بن کر گرا۔ فوج بھی اس سانحہ میں انتشار کا شکار نظر آئی۔ عوام بھی نعرہ لگاتے ہوئے سڑکوں پر نظر آئی۔ اس دوران لوگ ایسے بے بس نظر آئے کہ لوگ خون کے آنسو روتے رہے۔ ملک تو ٹوٹ چکا تھا مگر حکمرانوں کے اندر اقتدار کی ہوس بدستور بھی اب اسی طرح موجود تھی جیسے پہلے تھی۔ دوسری طرف ڈھاکہ کے لوگوں نے جشن منایا:

"قسمت میں ذلت، خواری اور صدیوں کی بے بسی تھی وہ ہاتھ جو ہر شے پر حسن تخلیق کرتے اور عالمی بازار میں زر مبادلہ کمانے کا ذریعہ تھے۔ وہ ہاتھ کمزور، لاغر اور مجبور تھے۔۔۔ اس لیے صدیوں سے سسکیاں نہیں سنی تھیں وہ خاموش آنسو بہانے کے عادی تھے۔"(۷۱)

ملک کے دو ٹکڑے ہونے کے بعد پاکستانی فوجی نوجوانوں نے ہندوستان کے اندر قید و بند کی صوبتیں برداشت کیں۔ جہاں ایک طرف اپنے ہی ملک کے دو ٹکڑے کر کے ڈھاکہ میں آزادی کا جشن منایا گیا وہیں مغربی پاکستان کے ہر گھر میں صف ماتم اس طرح بچھ چکی تھی کہ پوری قوم نے خود کو مجرم محسوس کرنا شروع کر دیا۔ مجیب الرحمٰن کے مطابق:

"مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا اور جس طرح پاکستانی فوج کو ہتھیار ڈالنا پڑے وہ اب ہماری تاریخ کا عبرت ناک باب ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے مٹا نہیں سکتی، کھرچ نہیں سکتی، اب ماضی کا حصّہ ہے۔"(۷۲)

مشرقی اور مغربی عوام پر ظلم و جبر کی وجہ سے ان کی دنیا اجڑ گئی تھی۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں اس واقعہ نے پوری قوم کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

کسی بھی قوم کے اندر اس کے اپنے احساسات اور جذبات ہوتے ہیں۔ ان احساسات اور جذبات کی بہت زیادہ اہمیت ہے ان کی بدولت وہ اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔ اپنے ملک کی سالمیت اور بقا کی خاطر اپنی جان تک دینے سے گریز نہیں کرتے۔ وطن کی خاطر اپنی جان، مال، اولاد الغرض سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے احساسات و جذبات کو مجروح کر دیا جائے تو ان کے اندر وطن سے محبت اور قربانی کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے:

"شہر کے کوچے و بازار میں ہنگامہ تھا، گہما گہمی تھی اور وہ اس شور و شہر میں کھوئی جاتی تھیں۔۔۔ آج اسی شہر میں وہ ایک بے بضاعت پرانے فیشن کے کپڑوں میں ملبوس محض ایک اینگلو بوڑھی خاتون تھیں "او صبر کر مائی" کہہ کر دکان دار سب سے آخیر میں سودا دیتا۔"(۷۳)

ملک کے دونوں بڑے صوبوں کے درمیان حساس طبعیت کے افراد موجود تھے کہ جن کو یہ سمجھ نہیں

آرہی تھی کہ ملک کس رخ کی طرف جارہاہے۔وہ ملک کے اندر لوگوں کی بے حسی سے بھی خائف تھے۔انھیں اپنے پڑوسی ملک کی بدمزاجی پر بھی افسوس ہوتا تھا۔وہ سوچتے تھے کہ ملک کے اندر آپس میں ہی جنگ کرنے کی باتیں کیسے کی جاسکتی ہیں حالانکہ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے سقوطِ ڈھاکہ سے قبل باہمی اتحاد اور اتفاق سے یہ عہد کرلیا تھا کہ اگر ان کے ملک پہ ذراسی آنچ آئی تو اپنے ملک کی دفاع کی خاطر خون کا آخری قطرہ بہادینے سے بھی گریز نہیں کریں گئے۔اس ملک میں نفرت، علیحدگی، فسادات، دکھ، درد اور تکالیف اور نفرتوں کے زہر نہیں گھلنے دیں گئے۔نشاط فاطمہ نے اس افسانے میں احساسات اور جذبات کو بھول جانے والے اور دکھ تکالیف میں مبتلا افراد کی آواز قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اور اس ساری صورتحال کو اجاگر کیا ہے۔

قیام پاکستان کی خاطر لوگ ایک نظریے کے تحت ایک جھنڈے تلے جمع گئے وہ قیام پاکستان کے لیے محبت کا جذبہ رکھتے تھے۔اس مقصد کے لیے انھوں نے بڑی قرباناں دیں تھیں۔بہت سارے لوگوں کی زمینیں، جائیدادیں، کاروبار، ہندوستان کے اندر موجود تھا۔ان میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے۔جو ہندوستان کے اندر معاشی حوالے سے خوشحال تھے۔ہندوستان کے اندر مالی حوالے سے بہتر پوزیشن میں تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے وطن کی محبت کی خاطر اس امید سے وہ سب کچھ چھوڑ دیا تھا کہ نیا ملک ان کا اپنا ہوگا جہاں وہ آزادی اور امن کے ساتھ زندگی گزاریں گئے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے دوران ایک بار پھر انھیں ہجرت اور فسادات کی صورت میں زمینوں اور جائیدادوں کو چھوڑنا پڑا:

"جو عذاب انہوں نے سہے تھے اور اذیت ناک سزائیں (اور اس زیادہ مبالغہ بھی تھا)
ان چوٹوں اور زخموں کے پُرانے درد پھر سے اٹھ رہے تھے۔"(۷۴)

قوم پرست سیاست دانوں نے ہمیشہ ذاتی مفاد کو ملکی مفاد پر ترجیح دی۔انھیں لوگوں کے دکھ اور ددر سے کوئی سروکار نہیں تھا۔انھوں نے لوگوں کے مسائل حل کرنے اور ان کے دکھوں اور تکالیفوں کا مداوا کرنے کے بجائے ان کی پریشانیوں میں آئے روز اضافہ ہی کیا۔ان کے ان اقدام کی بدولت مقامی اور غیر مقامی باشندوں کے درمیان نفرت پھیلی جس سے علاقائی اور معاشی مسئلوں کی بنیاد پڑ گئی۔بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کی بات ہونے لگی، صوبائی تعصب پھیلا۔ شروع میں ان سب افراد نے پاکستان کی خاطر قربانی دینے کا فیصلہ کیا

تھا۔ مگر اس ساری صورتحال کی وجہ سے بنگالی اور غیر بنگالی کا نعرہ گونجنے لگا۔ اس ملک کے اندر ہی مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں ایسی صورتحال پیدا ہوگئی جس سے مستقبل کے اندر بھی ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا ایسا جذبہ پیدا ہوا جو آج تک قائم ہے۔

نشاط فاطمہ نے اپنے افسانے میں سقوطِ ڈھاکہ کے دروان فسادات ، قتل وغارت گری، وحشت اور بربریت کے واقعات سے ایسے لوگوں کی داخلی کیفیت کی عکاسی کی ہے جو سقوطِ ڈھاکہ کے دوران نہ چاہتے ہوئے بھی ہجرت کرنے پہ مجبور ہوگئے۔ جب لوگ فسادات کے دوران زخمی ہو کر ہسپتالوں میں پہنچے تو ہوش آنے کے بعد فوراًہی سوال کرنے لگے کہ اب ہم کہاں جائیں؟ کیا ہمارے مقدر میں ایسے ہی دکھ اور درد لکھے ہیں؟ ہمیں تو ان حالات پر دکھ ہوتا ہے جن کے تحت ہم نے پہلے بھی اپنا وطن چھوڑا اور خطہ امن کو اپنا ملک سمجھا۔ ہمارے آباؤاجداد کی یادیں اس خطہ سے جڑی ہیں:

> "اللہ کی ہی مرضی تھی بندہ کیا کر سکتا ہے میں اپنی زمین نہیں چھوڑ سکتا یہاں ہمارے پرکھوں کی قبریں ہیں اور ہمارے زندہ بھی ہیں اگر میں چلا جاؤں گا تو اناڈ کی زمینیں کوئی ہندو یا سکھ سنبھال لے گا ان غریب مسلمان کسانوں اور بہت سے ان لوگوں کا کیا ہو گا جو وہاں کام کرتے ہیں اور رہتے ہیں وہ ہم سے آس لگائے رہتے ہیں ۔میں انھیں کسمپرسی میں اپنی زندگی میں چھوڑنے کی ہمت نہیں رکھتا۔"(۷۵)

نشاط فاطمہ نے تہذیب و کلچر کو ایک نئے پہلو میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے آئے ہوئے لوگ پاکستان کے اندر بسنا شروع ہوگئے۔ ایک بار پھر ان کے لیے لوٹ مار کا بازار گرم کیا گیا۔ فسادات کی صورت میں انھیں پھر ایک مرتبہ ہجرت نظر آنے لگی۔ وہ دکھوں اور تکالیفوں کی وجہ سے پھٹ پڑے کہ اب ہم دوبارہ اس زمین کو کیسے چھوڑیں جہاں پر ہمارے آباؤاجداد کی قبریں ہیں اور بہت سارے ایسے عزیز واقارب ہیں جو یہاں آباد بھی ہے۔ ہماریز مینوں اور جائیدوں میں بہت سے لوگ ہمارے ساتھ جڑے ہیں جو ہم پر ہی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم کسی صورت میں بھی دوسری ہجرت کے متمنی نہیں ہو سکتے۔ یہ ہمارے لیے ایک مشکل صورتحال ہوگئی۔

نشاط فاطمہ نے شہری زندگی کی منافقت، چور بازاری، ریاکاری کی صورتحال کی ایسی تصویر کشی کی ہے

جس سے انسانوں کی اصل پہچان اور شناخت ختم ہو جاتی ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے دوران معاشرے میں رہنے والے لوگ اس قدر بے بس ہو گئے تھے کہ وہ اپنوں ہی کی وجہ سے آئے روز معاشرتی مسائل کی دھندل میں پھنستے چلے جارہے تھے۔

"اری کوڑھ مغز جس طرح وہ زندہ ہیں ایسی زندگی سے تو موت اچھی حکومت ان پر ظلم وستم ڈھارہی ہے وہ ظلموں کے جبر وقہر میں ہیں۔"(۷۶)

انتشار اور اضطراب تمام معاشرے میں اس طرح پھیلا کہ اپنوں کے گلے کاٹنا شروع کر دیئے۔ اس سے معاشی، معاشرتی اور سماجی مسائل میں اضافہ ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ ملک دشمن عناصر سازشوں کا شکار ہو کر اور ایک دوسرے کے ساتھ ناروا سلوک کی وجہ سے اپنی ہی زمینوں پر اپنوں سے ہی الگ ہو گئے۔

"بنگال میں بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا تب بھی شادیوں کی محفلیں سج رہی تھیں۔"(۷۷)

ہنگاموں اور فسادات نے لوگوں کو سمو کر رکھ دیا۔ محب وطن افراد باہمی اختلافات اور نفرت کی وجہ سے اپنوں کے اندر ہی بیگانہ ہو گئے۔ یہ ایسے ذہنی اذیت تھی جس کے نشان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے دلوں و دماغ پر نقش ہو گئے۔

ایک قوم کے درمیان رنگ نسل اور زبان کا مسئلہ پیدا کر کے نفرت کو ہوا دی گئی۔ محبت اور امن کے نغمے گانے والے شر پسندوں کے تشدد کا نشانہ بنے۔ یکجہتی و یگانگت اور بھائی چارے کا درس دینے والے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھی امن سے نہ رہ سکے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھی ان پر ظلم وستم نہ سلسلہ نہ روک سکا۔ داخلی اور خارجی سطح کی وجہ سے ہر شہر کا ہر فرد متاثر ہوا۔ بنگال کی ہوا میں دہشت اور فضاؤں میں خوف طاری رہا۔ گولیوں کی صدائیں گونجتی رہیں۔ الغرض تقسیم کے بعد بھی انتشار اور نفاق کے درمیان میں تہذیب، تاریخ ورثے کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا گیا:

"خوفزہ نہیں ہوں کیونکہ اب میرے پاس کچھ کھونے کو نہیں ہے۔ مدت ہوئی میں زندگی کا جواز ہار گیا میں نے تین بار شہر لٹتے دنیا اجڑتے اور خون بہتے دیکھا۔ عجیب زندگی ہے جینا نہیں چاہتے مگر زندہ رہتے ہیں۔ اور زندگی ہے جینا نہیں چاہتے مگر زندہ رہتے ہیں اور زندگی گنوانے پر تیار نہیں۔۔۔ ضلع ندیا میں بنگو مینائی گرفتار کیے

گئے۔ اگر ایسا تھا تو بنگلہ دیش کیوں بنایا گیا۔ یہ بنگلہ دیش کے پیچھے کیوں پڑ گئے۔ وہ تو پہلے ہی دکھی لوگوں کا دیش ہے۔"(۷۸)

آزمائش اور درد کا لمبا عرصہ کب اور کیسے ختم ہو گا اس سوال کا جواب سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھی لوگوں کے ذہنوں میں موجود رہا۔ ہجرت در ہجرت کی وجہ سے اب ان کے حوصلے بھی ماند پڑ گئے تھے۔ ان کے پاس کھونے کے لیے بھی کچھ نہیں بچا تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد پاکستان سے محبت کرنے والے افراد کو چن چن کر تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ الغرض ملک میں پر سکون فضا کو مرتعش کرنے والے عناصر بے نقاب ہونے کے باوجود گرفتار نہیں ہو سکے۔ ظلم اور تشدد کا سلسلہ جاری رہا۔

ملک میں معمولی اور غیر معمولی واقعات کے ذریعے فرقہ وارانہ فسادات کی ہوا پھیلی تو اس سے جانی اور مالی نقصان کے لیے اشتعال دلایا جانے لگا۔ نظریات، امتیازات اور تصورات کی بنیاد پر اختلافات کی گہری جڑیں، فرقہ ورانہ شعور مزاج کے پسنے میں مددگار ثابت ہوا۔ رسم ورواج، کلچر اور تہذیب و تمدن کو غیر متوازن پابندی کی بنیاد بنا دیا گیا۔ اس سے ملک کے اندر لوگوں کی معاشی حالت ابتر ہو گئی۔ ملازمتیں تو دور کی بات ذاتی کاروبار کے لیے بھی ملک کا ماحول ناسازگار ہو گیا۔

"میں نے آپ کو بتایا کہ نوکری نہیں ملی باوجود بے حد تلاش کے بزنس کے لیے پیسہ کہاں سے لاؤں معاف کیجیے آپ کے اس مارشل لاء کے دور میں ہم نوجوانوں کو کچھ نہیں دستیاب، دیکھے برا نہ مانیے گا۔ نوکریاں بزنس یہ سب فوجیوں ہی کے بیٹوں کو نصیب ہے۔ دیکھے کب نیا سورج طلوع ہوتا ہے اور کب ہم نوجوانوں کی زندگیوں کی اندھیری کوٹھڑیاں منور ہوں مستطر ہوں"(۷۹)

لوگوں نے آس اور امید پر ملک کے حصول کے لیے قربانیاں دیں لیکن تخریبی عناصر نے ملک کے اندر ایسی صورتحال پیدا کر دی کہ ملک کے وسائل اور ملازمتوں پر مخصوص طبقے کی حکمرانی برقرار رہی۔ سازشی قوتوں کے ہاتھوں سے عوام کو یرغمال بنایا گیا۔

استحصالی ہاتھوں، جارہانہ روائیوں، ملازمت سے محرومی جیسے مسائل نے سقوطِ ڈھاکہ سے قبل اور بعد کے ماحول میں لوگوں کی زندگی کو اجیرن بنادیا۔ اس سے اپنے ہی ملک کے اندر لوگ ایک دوسرے کو شکوک وشبہات سے دیکھنے لگے اور ایسا ماحول پیدا ہو گیا کہ اپنے ہی ملک کے اندر لوگ تنگ دستی اور بے چارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔

حوالہ جات

۱۔ لطیف احمد شیرانی، قراداد پاکستان، خواجہ رضی حیدر (مترجم) قائداعظم اکادمی، لاہور، ۱۹۸۲، ص ۱

۲۔ عبدالرحمٰن منشی، پاکستان کی قیمت، جاوید اکیڈمی ملتان، طبع اول، جون ۱۹۸۳ ص ۱۴۶

۳۔ زینت افشاں، ڈاکٹر، اردو فکشن پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات، ادارہ گار غالب، کراچی، ۲۰۱۶ ص،

۴۔ احمد جاوید، پروفیسر، پاکستانی افسانہ، مشمولہ: پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، ادارہ عبارت، راولپنڈی، ۲۰۰۲، ص ۲۱۸

۵۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، سقوط مشرقی پاکستان، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۴۳

۶۔ نشاط فاطمہ، مزدور، مشمولہ انسان کی تلاش، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۸ ص ۱۷۸

۷۔ لیفٹیننٹ کرنل ذوالفقار احمد خان، حیات جاوداں، نیشنل بک فانڈیشن، کراچی، ۱۹۷۷ ص ۴

۸۔ امبر شہزادی، نشاط فاطمہ کے ناولوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (مقالہ برائے ایم فل اردو) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۹

۹۔ عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۴

۱۰۔ نثار ترابی، ڈاکٹر، سقوط ڈھاکہ کا سیاسی پس منظر اور غزل میں اس کا تخلیقی وفور، مشمولہ دریافت، شمارہ ۱۳، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، ص ۱۵۸

۱۱۔ نشاط فاطمہ، گم کردہ راہ منزل، مشمولہ انسان کی تلاش، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء ص، ۱۱

۱۲۔ مسعود مفتی، لمحے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۱۳

۱۳۔ نشاط فاطمہ، گم کردہ راہ منزل، مشمولہ انسان کی تلاش، ء ص، ۱۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۶۔ نشاط فاطمہ، انسان کی تلاش، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۲۵

۱۷۔ نشاط فاطمہ، وقت کی صلیب، مشمولہ انسان کی تلاش ص ۶۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۶۴

۱۹۔ نشاط فاطمہ، بھر بھری ریت کا طوفان، مشمولہ انسان کی تلاش ص ۳۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۵

۲۱۔ نشاط فاطمہ، آخری خواہش، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۲۴۵

۲۲۔ نشاط فاطمہ، گم کردہ راہِ منزل، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۷

۲۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۷

۲۴۔ میجر جنرل (ر) تجمل حسین ملک، میری جدوجہد کی داستان، جنگ پبلی کیشنز ۱۹۹۶ ص ۱۶۹

۲۵۔ نشاط فاطمہ، گم کردہ راہِ منزل، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۱۲

۲۶۔ نشاط فاطمہ، انسان کی تلاش، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۱۱

۲۷۔ نشاط فاطمہ، وقت کی صلیب، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۶۳

۲۸۔ ایضاً، ص ۶۳

۲۹۔ ایضاً ص ۶۹

۳۰۔ نشاط فاطمہ، کارپان ہلکی ہو گئی، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۱۱۹

۳۱۔ نشاط فاطمہ، مزدور، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۱۷۹

۳۲۔ نشاط فاطمہ، آج کے غم کے نام، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۱۹۷

۳۳۔ سلیم منصور خالد، البدر، ادارہ مطبوعات طلبہ، لاہور، ۱۹۸۵ ص ۲۱

۳۴۔ نشاط فاطمہ، آج کے غم کے نام، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۲۰۵

۳۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع اول، ۱۹۸۰ء، ص ۶۳

۳۶۔ نشاط فاطمہ، دل گرفتہ لوگ، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص ۲۸

۳۷۔ نشاط فاطمہ، ایک ساعت، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص ۵۲

۳۸۔ نشاط فاطمہ، یادوں کے جلتے بجھتے دیے، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص ۱۱۸

۳۹۔ نشاط فاطمہ، وقت فتنہ گر، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص ۲۱۱

۴۰۔ ایضاً، ص۲۱۶

۴۱۔ ایضاً، ص۲۱۹

۴۲۔ محمد عبد الخالق (مرتب)، تعارف پاکستان، ناظر پرینٹنگ پریس، کراچی، ۱۹۴۹ء، ص۳۰۱

۴۳۔ نشاط فاطمہ، گم کردہ راہِ منزل، مشمولہ انسان کی تلاش، ص۱۰

۴۴۔ ایضاً ص۱۸

۴۵۔ ایضاً ص۱۹

۴۶۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۱۶۰

۴۷۔ نشاط فاطمہ، انسان کی تلاش، مشمولہ انسان کی تلاش، ص۲۰

۴۸۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص۳۰۹

۴۹۔ نشاط فاطمہ، انسان کی تلاش، مشمولہ انسان کی تلاش، ص۲۱

۵۰۔ نشاط فاطمہ، بھر بھری ریت کا طوفان، مشمولہ انسان کی تلاش، ص۳۳

۵۱۔ نشاط فاطمہ، وقت کی صلیب، مشمولہ، انسان کی تلاش، ص۶۴

۵۲۔ محمد عالم خان، ڈاکٹر، اردو افسانے میں رومانوی رجحانات، علم و عرفان پبلیشرز، س ن، ص۴۳۱

۵۳۔ نشاط فاطمہ، وقت کی صلیب، مشمولہ، انسان کی تلاش، ص۷۰

۵۴۔ نشاط فاطمہ، پیمانے چُور حُور ہوئے، مشمولہ انسان کی تلاش، ص۱۰۱

۵۵۔ محمد ذاکر، ڈاکٹر، آزادی کے بعد ہندستان کا ادب، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص۲۹

۵۶۔ نشاط فاطمہ، کرپان ہلکی ہوگئی، مشمولہ انسان کی تلاش، ص۱۱۶

۵۷۔ عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ ص۲۰۱۴

۵۸۔ نشاط فاطمہ، ایک پتہ، مشمولہ انسان کی تلاش، ص۱۸۹

۵۹۔ وسیم شیخ، ہتھیار کیوں ڈالے؟ غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور، س ن، ص۵۴

۶۰۔ نشاط فاطمہ، آج کے غم، مشمولہ انسان کی تلاش، ص۲۰۲

۶۱۔ نشاط فاطمہ، ایک لمحہ، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۲۱۱

۶۲۔ ایضاً، ص ۲۱۱

۶۳۔ ایضاً ص ۲۱۲

۶۴۔ نشاط فاطمہ، گھر کے مکین، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص ۱۵

۶۵۔ نشاط فاطمہ، وہ ڈھونڈتی رہی، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص ۴۴

۶۶۔ نشاط فاطمہ، ایک ساعت، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص ۵۱

۶۷۔ ایضاً، ص ۵۳

۶۸۔ ایضاً، ص ۵۴

۶۹۔ ایضاً، ص ۵۵

۷۰۔ نشاط فاطمہ، وہ چلی پیا کے دیس، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۱۰۲

۷۱۔ نشاط فاطمہ، یادوں کے جلتے بجھتے دیے، انسان کی تلاش، ص ۱۱۱

۷۲۔ مجیب الرحمٰن شامی، سقوط ڈھاکہ کا حساب (مضمون)، مشمولہ، روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۴ دسمبر، ۱۹۹۴ء، ص ۴

۷۳۔ نشاط فاطمہ، یادوں کے جلتے بجھتے دیے، انسان کی تلاش، ص ۱۱۴

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۷۵۔ نشاط فاطمہ، کھنڈر، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۱۵۰

۷۶۔ نشاط فاطمہ، حروف امر ہو گئے، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۱۷۲

۷۷۔ ایضاً، ص ۱۷۴

۷۸۔ نشاط فاطمہ، وقت فتنہ گر، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص ۲۱۹

۷۹۔ نشاط فاطمہ، وہ محض ایک شب کا ہمدم تھا، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص ۲۲۶

باب سوم

سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں نشاط فاطمہ کی افسانہ نگاری:
کرداری تناظر میں تجزیاتی مطالعہ

الف) مرد کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ

اردو ادب میں ڈرامہ، ناول اور افسانہ ایسی اصناف ہیں جو انسانی کرداروں سے مزین ہیں۔ کردار کسی بھی کہانی کی جان ہوتے ہیں۔ کسی بھی کہانی کی کامیابی کا دارومدار اس کے کرداروں میں ہوتا ہے۔ ہر صنف کے اندر کرداروں کے الگ الگ تقاضے ہوتے ہیں۔ چونکہ افسانے کا موضوع انسان کے جذبات کے متعلق ہے اس لیے افسانہ نگاری میں کرداروں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مصنف کے لیے کردار نگاری کو صحیح معنوں میں اُجاگر کرنا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ افسانہ میں جاندار کردار ہی جان ڈالتے ہیں۔ افسانہ میں دوسری اصناف کی نسبت کرداروں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ افسانے کے داخلی اور خارجی عوامل کی نشاندہی کرداروں کے تخیل احساسات، واقعات جذبات اور حرکات سے ہوتی ہیں۔ کردار نگاری کے حوالے سے مختلف اہل علم ودانش نے اپنا قلم اٹھایا ہے، جن میں سید وقار عظیم، ،ڈاکٹر نجم الہُدی، عبد القادر سروری نمایاں ناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

> "کردار افسانہ نگار کے ہاتھ میں کٹھ پتلی معلوم ہوتا ہے۔ جب تک فنی تربیت کی مدد سے اسے ماحول اور واقعات کے مطابق نہ بنایا جائے۔"(۱)

کہانی کا دارومدار کرداروں کی خارجی وداخلی کیفیت سے ہوتا ہے۔ کرداروں کا حلیہ، گفتگو اور لب ولہجہ اس کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔ افسانے کی اصلیت کو کردار اجاگر کرتے ہیں۔ عبد القادر لکھتے ہیں:

> "اچھا فنکار جس وقت اپنے کسی کردار سے روشناس کراتا ہے تو کچھ ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے کہ اس کردار کی کم از کم ایسی چند خصوصیات پڑھنے والے کے سامنے ضرور آجاتی ہے جو اس کے ذہنی جذباتی اور اخلاقی خصائص کو وضع کرتی ہے۔"(۲)

کرداروں کی اقسام:

۱۔ کہانی کا مرکزی کردار:

مرکزی کردار سے مراد وہ کردار ہوتے ہیں جس کے ارد گرد کہانی گھومتی ہے۔افسانے کے اندر مرکزی کردار کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔کہانی کا تانہ بانہ اس کردار سے ہی جڑا ہوتا ہے۔مرکزی کردار ہی کہانی کو اختتام تک پہنچاتا ہے۔مرکزی کردار ہمہ جہت شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔مرکزی کردار کو کہانی کا ہیرو بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ ثانوی کردار:

کہانی میں مرکزی کردار ایک ہی ہوتا ہے۔مگر کچھ ثانوی کردار کہانی کی تکمیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔کہانی میں ثانوی کردار بھی نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔مرکزی کردار کی معاونت کر کے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

۳۔ ذیلی کردار:

مرکزی اور ثانوی کرداروں کے ساتھ ساتھ ذیلی کردار بھی کہانی کا ایک اہم حصّہ ہوتے ہیں۔ذیلی کردار بہت ہی تھوڑے وقفے کے لیے نظر آتے ہیں۔مگر ذیلی کردار ثانوی اور مرکزی کردار کی معاونت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔کہانی میں ثانوی کردار ضمنی کردار ادا کرتے ہیں۔

۴۔ منفی کردار:

منفی کردار عموما" شر اور بدی کے کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ان کرداروں کی ذہنی و نفسیاتی کیفیت اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ خیر اور شر کے کاموں کی طرف ان کی رغبت کسی طور ممکن نہیں ہوتی۔ایسے کردار لڑائی جھگڑا، مار پیٹ، ظلم و تشدد، قتل و غارت گری اور اخلاقی بے راہ روی کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔بعض افسانوں میں منفی کرداروں کے حامل افراد ایسا طرزِ عمل ایک مخصوص مدت تک سرانجام دینے کے بعد اس روش کو ترک کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔تاہم عام طور پر منفی کردار کسی بھی کہانی میں آخر تک اپنی

انفرادیت برقرار رکھتے ہیں۔

5۔ سپاٹ کردار:

سپاٹ کردار کہانی کے اندر شروع سے آخر تک ایک ہی رویے کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ کردار کسی خاص ردعمل اور کسی خاص صورتحال کی بجائے ہمیشہ طے شدہ ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔

پیچیدہ کردار ایسے کردار ہوتے ہیں جن کی شخصیت پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کردار مزاحیہ کردار بھی ہوتے ہیں جو کسی بھی افسانے کے اندر اپنی حرکات وسکنات سے مزاح کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ بعض کردار باغی کردار کے طور پر سامنے آتے ہیں اور کچھ کردار محدود یا عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں جو کسی خاص صورتحال میں ظاہر ہو کر غائب ہو جاتے ہیں جیسا کہ کھلاڑی، مسافر اور خریدار وغیرہ

نشاط فاطمہ بیسویں صدی کی افسانہ نگار خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں جہاں دیگر موضوعات کو پیش کیا ہے وہیں ان افسانوں کا ایک اہم پہلو سقوط ڈھاکہ ہے۔ عذرا لیاقت لکھتی ہیں:

"نشاط فاطمہ نے مشرقی پاکستان کو موضوع بنایا ہے۔۔ ۔انہیں بہاریوں سے بھی ہمدردی ہے۔ ان کے کردار اعلیٰ روایات واقدار کے حامل نظر آتے ہیں"(۳)

نشاط فاطمہ نے اس دور کے معاشرے کی تصویر کشی کی ہے اور ان تصاویر میں یوں رنگ بھرے ہیں کہ تمام تر احوال اپنی حقیقت سمیت قاری کے ذہن پر نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان تمام حالات واقعات نے نشاط فاطمہ کو گہرا متاثر کیا اور وہی نقش ان کی تحریروں میں واضح نظر آتا ہے۔ انہوں نے مختلف کرداروں کے ذریعے اس دور کے حالات اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور مختلف کرداروں کے ذریعے سقوط ڈھاکہ کے سانحے کے دوران حالات وواقعات، مناظر، ہجرت سے دوچار لوگوں کی کہانیاں، فسادات کی صورت میں لوگوں کو درپیش آنے والی پریشانیوں، دکھوں اور ان کی داخلی اور خارجی کیفیت کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ سقوط ڈھاکہ کی ساری کہانی ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ دونوں افسانوی مجموعوں میں کرداروں کی پیش کش کا جائزہ سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں نشاط فاطمہ کی افسانہ نگاری: کرداری تناظر میں تجزیاتی مطالعہ کے تناظر میں کیا گیا جس سے سقوط ڈھاکہ کی ساری صورتحال ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

ا۔ مرد کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ:

سقوط ڈھاکہ کی عکاسی مردانہ کرداروں کی صورت میں افسانے "گم کردہ رہِ منزل"، "انسان کی تلاش"، "مزدور"، "ایک پتہ"، آج کے غم کے نام"، "دل گرفتہ لوگ" اور "وقت فتنہ گر" میں کی گئی ہیں۔

افسانہ "گم کردہ رہِ منزل" میں مردانہ کرداروں کے ذریعے سقوط ڈھاکہ کے حالات وواقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔ جس میں ہمہ وقت کہانی کے تین رخ سامنے آتے ہیں۔ نشاط فاطمہ نے مختلف کرداروں کے ذریعے اس دور کے حالات واقعات، ہجرت اور فسادات کی عکاسی کی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار "واحد متکلم کا مرد کردار" ہے۔ اس کے احاطے میں اور بھی کوٹھیاں ہیں۔ لیکن "میمن سنگھ" کی کوٹھی باقی تین کوٹھیوں سے چھوٹی ہے۔ حالات اور واقعات کی صورتحال میں جب "واحد متکلم کا مرد کردار" پڑوسی گھر والے افراد کو چھت سے دیکھتا ہے تو وہ خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ ہم سب ابھی تک زندہ ہیں:

> "میمن سنگھ کی کوٹھی نمبر ا کے احاطہ میں روش پر سے جھانکتا ہوں۔ یہ بقیہ تین کوٹھیوں سے چھوٹی ہیں۔ اس وقت یہ کھنڈر دکھلائی دیتی تھی۔ مگر اب جگمگا رہی ہے۔ اس میں جو خاندان رہتا ہے اس نے اس کو چار چاند لگا دیے ہیں۔۔۔ باغ میں کام کرتے ہوئے مالی نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ وہ کھرپی ہاتھ میں لیے چلا آتا ہے۔ یہ اس کوٹھی کا پرانا مالی ہے۔ "بابو آپ" وہ حیرت سے مجھے لپٹا کر کہتا ہے۔ ہاں ہم زندہ بچ گئے تھے۔ میں لاپرواہی سے کہتا ہوں۔ ہم بھی تو بابو۔ اٹھنے تک جندہ ہیں۔"(۴)

نشاط فاطمہ نے مختلف کرداروں کے ذریعے حالات، واقعات، ہجرت اور فسادات کی عکاسی کی ہے۔ بہت سے کردار ایسے ہیں جو افسانے میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں "زین" ایسا کردار ہے جو مردانہ کرداروں میں سب سے نمایاں ہے۔ افسانہ "گم کردہ رہ منزل" میں "زین" سقوط ڈھاکہ کی دردناک کہانی اور حالات کو کراچی کے حالات واقعات سے موازنہ کی صورت میں پیش کرتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کراچی سے چٹاگانگ اور چٹاگانگ سے کراچی کی طرف ہجرت در ہجرت سے وہ اور اس کا خاندان بری طرح ٹوٹ چکا ہے۔ ایک ہجرت سے دوسری ہجرت کے دوران بھی اسے سکون اور امن نظر نہیں آتا۔ وہ ایک ایسی

جگہ کی تلاش میں ہے جہاں امن و سکون ہو، باہمی اتحاد ہو، لیکن اسے کہیں بھی ایسا ماحول میسر نہیں آتا۔ وہ ماضی کو یاد کرتا ہے مگر وہاں بھی اس طرح کی عبرت ناک صورتحال تھی۔ زمانہ حال دیکھتا ہے تو یہاں بھی یہی درد اور دکھ کی کہانی ہے۔

"گم کردہ رہ منزل" میں اسے اپنی منزل چٹاگانگ اور کراچی دونوں میں گم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ آخر وہ جائے تو کہاں جائے۔ کراچی سے چٹاگانگ، چٹاگانگ سے کراچی میں رہ کر وہ اور اس کا خاندان ہجرت کرنے میں مجبور ہو جاتے ہیں۔ کراچی کی صورتحال ناخوشگوار دکھائی دیتی ہے۔ اسے ایسا لگتا ہے کہ اس کی دھرتی اس پر ہی تنگ کر دی گئی ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے:

> "آسمان پر بادل اکھٹے ہو رہے ہیں۔ فضا میں طوفان کی دھمکی ہے۔ ہوا میں پانی اور مٹی کی خوشبو ہے۔ کوئی آن میں جل تھل بھر جائیں گئے۔"(۵)

سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں "زین" ایک ایسا کردار ہے جو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں حالات کا موازنہ کرتا ہے۔ مغربی پاکستان کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں غربت کا تناسب زیادہ ہے۔ ہندوؤں کی بنگال پر اجارہ داری کی وجہ سے بنگالی مسلمان عرصہ دراز سے استحصال کا شکار رہے۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی حصّہ معاشی عدم مساوات کا حصّہ رہا۔ افسانہ "گم کرہ رہ منزل" میں "زین" کا کردار مشرقی پاکستان کی تصویر ہمارے سامنے لاتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے دوران مشرقی پاکستان کی جانب ہجرت کرنے والوں پر ڈھاکہ تنگ کر دیا گیا۔ لوگوں کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر ان کی منزل کیا ہے۔ وہ جائیں تو کس طرف جائیں۔ وہ سوچنے لگے کہ وہ محب الوطن ہیں یا نہیں۔ نشاط فاطمہ نے "زین" کے کردار کے ذریعے بنگلہ دیش کے قیام کے دوران مشرقی پاکستان کی طرف جانے والے لوگوں کی دکھ بھری داستان کو قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے:

> "جلاوطن ہوئے اس جرم کی پاداش میں کہ حب الوطن تھے میں اس دھرتی پر دوبارہ لوٹتا ہوں۔ لیکن عارضی طور پر جو آج بنگلہ دیش کہلاتی ہے۔ اور یہ شہر جس میں اجنبی کی طرح کھڑا ہوں۔ بنگلہ دیش کا یہ شہر ڈھاکہ ہم پر تنگ ہو گیا ہے۔"(۶)

سقوط ڈھاکہ کے دوران ایک اہم واقعہ یہ بھی تھا کہ حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے ہی ایک دوسرے سے چھت چھیننے لگے۔ لوگوں کو اپنے ہی گھروں سے ایک دفعہ پھر ہجرت کی کیفیت سے

دوچار ہونا پڑا۔ اپنے ہی اپنوں کے دشمن ہو گئے۔ وطن کی زمین ان کے قدموں تلے ایسے سکڑ گئی جیسے ان کا اس زمین سے تعلق ہی نہ ہو۔ افسانہ "گم کردہ رہ منزل" میں "زین" ایک ایسا کردار ہے جو سقوط ڈھاکہ کے دوران اس قسم کی صورتحال کی کہانی کو بیان کرتا ہے:

"میں یہاں تنہا کھڑا ہوں۔ میرے پیروں نے چند منٹ دھرتی گھیر رکھی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے یہی دھرتی میرے قدموں تلے سکڑ گئی تھی۔ اور میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوا۔"(۷)

زین جو معاشرتی حالات کی وجہ سے اس دور کی بات بھی نہیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کچھ ایسا ہو جائے کہ وہ اس جنم سے پچھلے جنم میں چلا جائے۔ حالات اس قدر پیچیدہ ہو چکے تھے کہ وہ اس دور کے اندر آسانی سے سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔

"میں اس سمے صرف اس پچھلے جنم کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یوں کہ اس جنم سے میں تو خوفزدہ ہوں۔ اور اس میں اپنے آپ کو فٹ نہیں کر پاتا۔ اب رہا آنے والا وقت تو۔۔۔"(۸)

"زین" کا کردار افسانہ "گم کردہ رہ منزل" میں ایک ایسا کردار ہے جس کا سامنا ایک کردار "نئے آدمی "یعنی اس کے ضمیر اور اس کی داخلی دنیا سے ہوتا ہے۔ یہاں "نیا آدمی" ایک علامتی کردار کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جو اس کا ضمیر ہے۔ "زین" ماضی کی تلخ حقیقتوں اور جب درد کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو "نیا آدمی" اس کو ماضی کی بجائے حال کی طرف توجہ کرنے کو کہتا ہے کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد حالات و واقعات اسی طرح ہیں جیسے پہلے تھے:

"ہر طرف اس نے اپنے ظلم کی کمین گاہوں کا جال بچھایا۔ لیکن نئے آدمی نے پرانے آدمی کی داستان پر دھیان نہ دیا۔ وہ دراصل حال سے مایوس اور ذات کے جنجال میں گھیرا ہے۔ اس کی حالت پر میرے اندر گریہ ہوا اور میں نئے آدمی سے بہت ہی مایوس ہوا۔"(۹)

کسی بھی معاشرے میں امن وامان نہایت اہم ہوتا ہے۔ لیکن اس دور کے اندر حالات اتنے کشیدہ ہو چکے تھے کہ اس دور میں رہنے والے لوگ امن لفظ سے بھی ناآشنا ہو چکے تھے۔

"امن ایک ایسی شئے ہوتی ہے جس میں حفاظت بھی ہوتی ہے۔ شاہد موجودہ نسلی لغت
اس لفظ کے معانی کی تلاش میں ہو۔"(۱۰)

"زین" کا کردار حالات واقعات کے تناظر میں ماضی اور حال میں امن وامان اور خوشگوار لمحات کا موازنہ کرتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں وہ دیکھتا ہے کہ ماضی میں اگر تباہی وبربادی تھی تو کچھ لوگ امن کے بھی خواہاں تھے۔ کہیں نہ کہیں امن اور خوشگواری نظر آتی تھی۔ مگر حال کی نئی نسل امن کے مطلب سے بھی آگاہ نہیں۔ نئی نسل بھی حقیقت نگاری کی بجائے تخیلی دنیا میں رہتی ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت امن وامان کے مسائل کی وجہ سے لوگوں کو گہرے کرب سے گزرنا پڑا جو کہ ایک ناقابل فراموش داستان ہے۔ حال کے اندر بھی امن وامان کی صورتحال گھمبیر ہے۔ لوگ کس طرف جارہے ہیں اور ان کی منزل کیا ہے اس سے ان کو کچھ سروکار نہیں۔ حالات اب بھی گھمبیر ہیں۔

سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں ملک دشمن سازشی عناصر کا شکار ہونے والے لوگ آزادی کے بعد پھر آزادی کے خواہاں تھے۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد آزاد ریاست حاصل کرنے میں کامیاب تو ہوگئے تھے لیکن وہ دشمن کی چالوں کا ایک بار پھر شکار ہوگئے۔ افسانہ "گم کردہ رہ منزل" میں ایک اور مرد کردار کا نام اہم ہے جو "زین" کے "ابا" کا ہے جن کے آباؤ اجداد نے تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ زین کے "ابا" متحدہ پاکستان سے محبت کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہجرت کے بعد ایک اور ہجرت ان کے لیے کتنا تکلیف دہ مرحلہ ہوگا۔ جب مشرقی پاکستان کے لوگوں نے الگ ہونے کی تحریک چلائی تو زین کے "ابا" کو بنگلہ دیش کی آمیزیش سخت غصہ دلاتی تھی۔ انہوں نے بنگلہ دیش کے قیام کی مخالفت کی تھی:

"حالانکہ اس دیش سے میرا کوئی سمبندھ نہیں۔ جاتے سمے سب نے بہت کہا تھا، جاتے ہو تو مڑ کر ضرور آنا یہ تمھارا دیس ہے، مگر ابا اکھنڈ پاکستان کے قائل تھے۔ یہ بنگلہ دیش کی آمیزیش انہیں غصہ دلاتی تھی۔"(۱۱)

مشرقی اور مغربی پاکستان میں رہنے والے لوگوں کے درمیان آپس میں اختلافات اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ ایک دوسرے کا نام سن کر غصے میں آجاتے تھے۔ ملک کے دولخت ہونے کے بعد کوٹھیاں اور مکان تو اپنی جگہوں میں جوں کے توں قائم تھے مگر وہاں رہنے والے بدل گئے۔

"میں ایک انسان تھا جس کے ہاتھ میں نہ تیر کمان تھا اور نہ گولی داغنے والی فولاد کی نالی۔ میں تو آشتی اور امن کا دلدادہ تھا۔ آج بھی یہ کوٹھیاں اسی طرح کھڑی تھیں اس کے مکین بدل گئے تھے۔"(۱۲)

سقوط ڈھاکہ کے دوران مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں طرف ایک بار پھر لوگوں کو گھر چھوڑنے پڑے۔ ماضی کی یادیں پہلے ہی تلخ تھیں۔ دکھوں سے ابھی جان نہیں چھوٹی تھی کہ ایک اور آزمائش نے آن گھیرا تھا۔ افسانہ "گم کردہ رہ منزل" میں "زین" کے واحد متکلم کردار کے ذریعے ایک اور کہانی کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد دونوں طرف کوٹھیاں اور مکان اسی طرح تھے جیسے وہ پہلے قائم تھے۔ عمارتوں کی چمک دمک بھی قائم تھی، بہت سارے لوگ امن چاہتے تھے، بہت سارے لوگوں کے ہاتھوں میں بندوق نہیں تھی اور بہت سارے لوگوں کو گولی چلانا نہیں آتی تھی۔ سقوط ڈھاکہ کے دوران مکان اسی طرح قائم رہے لیکن مکین بدل گئے جس سے ایک دفعہ پھر اپنوں کو اپنوں سے دور ہونا پڑا۔

سقوط ڈھاکہ کے دوران ملک کے دونوں حصّوں میں حالات بہت زیادہ کشیدہ تھے۔ چُن چُن کر اپنوں کے گلے کاٹے گئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی لوگوں کو دکھ اور تکالیف برداشت کرنا پڑی۔

افسانہ "گم کردہ رہ منزل" میں "مالی" کا کردار بھی ایک ایسا کردار ہے جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے لوگوں کو مرتا ہوا اور تڑپتا ہوا دیکھا ہے۔ وہ ماضی کو یاد کر کے ہمیشہ خون کے آنسو روتا ہے۔ اور اپنوں سے بچھڑنے کا درد بیان کرتا ہے۔ "زین" جب ہجرت کر کے مغربی پاکستان کے شہر کراچی پہنچتا ہے تو وہ اسے زندہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ بڑے درد سے وہ ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ ہم زندہ بچ گئے۔ ان کے چہروں پر حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ایثار ملتے ہیں:

"مالی نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ وہ کھرپی ہاتھ میں لیے چلا جاتا ہے۔ یہ اس کوٹھی کا پرانا مالی ہے۔ وہ مجھے باغ میں پڑے ہوئے مونڈھے پر بٹھاتا ہے۔ "بابو آپ" وہ حیرت سے مجھے لپٹا کر کہتا ہے۔ "ہاں ہم زندہ بچ گئے تھے" میں لاپرواہی سے کہتا ہوں۔ ہم بھی تو بابو ابھی تک جندہ ہیں۔"(۱۳)

سقوط ڈھاکہ کے دوران دیگر شہروں کی طرح کراچی کے حالات بہت زیادہ خراب تھے۔ کراچی میں

معیشت کا پہیہ رک گیا تھا۔ آئے روز فسادات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ "زین" کے خاندان والے جب کراچی سے چٹاگانگ جاتے ہیں اور پھر سقوط ڈھاکہ کی وجہ سے چٹاگانگ سے کراچی کی طرف آتے ہیں تو وہی داستانیں، آئیں، آنسو اور دکھ بھری داستانیں انھیں کراچی میں بھی نظر آتی ہیں۔ اس ساری صورتحال میں دکھ اور تکالیف برداشت کر کے اور خون کی ندیاں بہتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر وہ زندگی سے تنگ آ گئے۔ اب انہیں اپنی زندگی ایک فلم کی حیثیت سے نظر آ رہی تھی۔ جس کے وہ اب تماش بین بن چکے تھے۔ زندگی ان کی دسترس سے نکل چکی تھی۔ ان کے جذبات اور احساسات ختم ہو چکے تھے:

> "میں اپنا دھیان کراچی کی طرف پلٹائے جاتا ہوں۔۔۔ میرے پاس اب کوئی جذبہ اور احساس نہیں۔ وہ سب یہیں پیروں تلے روندا گیا تھا۔ اور زندگی اب میری دسترس سے باہر ہے۔ مگر اب وہ جذبات سے بے قابو ہو چکا ہے۔ اسے کیا معلوم زندگی اب میرے نزدیک ایک فلم کی حیثیت رکھتی ہے اور میں اس کا تماش بین ہوں۔ میری چشم پر دیکھنا لازم آیا۔ اچھا اور برا دونوں۔۔۔ میں اسے کس طرح سمجھاؤ کہ دنیا تو ایک گہنگاہ ہے۔ اور اب کسی کے گزر جانے پر آنسو بہانے کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ ویسے اب ماضی کو بھی یاد کرنے کا رواج نہیں۔ رواج تیزی سے بدل رہے ہیں لباسوں کی طرح۔"(۱۴)

افسانہ "گم کردہ رہ منزل" میں نشاط فاطمہ نے سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں کراچی کی صورتحال کا نقشہ کھینچا ہے۔ کراچی کی صورتحال کی تصویر کشی کے لیے واحد متکلم کے کردار "خرگوش" کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ "زین" کا کردار جب "خرگوش" سے مخاطب ہوتا ہے تو "خرگوش" اسے دیکھ کے ڈر جاتا ہے اور ایک جھاڑی میں چھپ جاتا ہے۔ "خرگوش" کا کردار اگرچہ ایک علامتی کردار ہے جس نے شہر کے فسادات اور لوگوں کو دکھوں میں ڈھوبتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ "زین" سے دکھ بھری داستان بیان کرتا ہے کہ جب سے تم نے یہاں سے ہجرت کی یہاں تب سے سناٹا ہی سناٹا ہو گیا ہے۔ حالات آئے روز خراب سے خراب تر ہوتے گئے:

> "یہاں آدمی کا بہت خوف ہے۔ جب سے گئے ہو میں اسی جھاڑی میں چھپا بیٹھا رہتا ہوں۔ مبادا آدمی سے مڑ بھیڑ نہ ہو جائے۔ اچھا میرے ڈر کی تو خیر ہے یوں کہ میں تو ایک حقیر سا خرگوش ہوں۔ میں نے تو آدمی کو آدمی سے ڈرتے دیکھا۔"(۱۵)

سقوط ڈھاکہ کے دوران ملکی عناصر نے ملک کے اندر سازشوں کا جال بچھایا۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کر دی۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے بہانے وہ ان ہی کے جذبات سے کھیلنے لگے۔ مدد کے نام پر انہوں نے لوگوں کو فسادات اور خون ریزی کے لیے اکسایا۔ جس کے نتیجے میں شہروں کے اندر چیخیں، آہ وبکاء، قتل وغارت کی فضا قائم ہو گئی۔ اپنے ہی اپنوں کے ہاتھوں بے دردی سے مارے گئے:

"انیس سو اکہتر کی بے تحاشہ فلم کا تماشا کرنے لگا چیخیں۔ آہ بکاو، بھیگی بھیگی فضا میں اندھیرے کے پار بکھرتا چلا گیا۔"(۱۶)

افسانہ "گم کردہ رہ منزل" میں "زین" کا کردار کراچی سے چٹاگانگ اور چٹاگانگ سے کراچی کی طرف ہجرت کرتا ہے اور دونوں طرف کی صورتحال کی عکاسی کرتا ہے کہ دونوں طرف کی زمین ہی ہمارے لیے سکڑ گئی ہے۔ دونوں طرف امن وسکون نہیں ہے۔ دونوں طرف لوگ محرومیت کا شکار ہیں۔ دونوں طرف فرق یہ ہے کہ چٹاگانگ کی مٹی نم اور نرم ہے جبکہ کراچی کی مٹی ریتلی اور سخت ہے۔ لیکن دونوں طرف لوگوں کی صورتحال مایوس کن ہے۔ اب ہم جائیں تو کدھر جائیں؟ رہیں تو کدھر رہیں؟ ہمارا ملک کون سا ہے؟

"مگر آج پھر دھرتی میرے قدموں تلے سکڑ رہی ہے۔ تھوڑا سا فرق ہے۔ وہاں کی مٹی نم اور نرم تھی۔ یہاں کی ریتلی اور سخت ہے۔ میرے ایک طرف چٹاگانگ کا ساحل ہے۔ دوسری طرف کراچی کے بیچ میں سمندر جھاگ اڑا رہا ہے۔ جاؤں تو کدھر جاؤں گم کردہ رہ منزل۔"(۱۷)

سقوط ڈھاکہ ایسا واقعہ ہے جس نے داخلی اور خارجی سطح پر لوگوں کو ایک ابتر صورتحال میں مبتلا کر دیا ہے۔ "زین" کا کردار ایک ایسا کردار ہے کہ جب اس کا قافلہ چٹاگانگ سے کراچی آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ یہاں بھی اس کے جانے پہچانے جیسے عذاب ہیں جیسے چٹاگانگ میں تھے۔ یہاں بھی کرب کی کیفیت ہے۔ یہاں بھی دکھوں کی وجہ سے لوگ خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ جب دونوں طرف امن وسکون نہیں ہے تو آخر کب تک ان جیسے خانہ بدوش لوگ آج یہاں اور کل وہاں کا سفر کرتے رہیں گئے:

"وہی آہ وبکاہ، وہی کرب وبلا، وہی سزا وجزاء، سارے جانے پہچانے عذاب، ہوئے کیوں نہ ہم خانہ بدوش آج یہاں تو کل وہاں۔"(۱۸)

۱۹۷۱ء کے دوران کراچی کی صورتحال بہت زیادہ خراب تھی۔افسانہ "گم کردہ رہ منزل" میں "زین" کا کردار سوچتا ہے کہ اگر وہ ماضی میں جھانکے تو معلوم نہیں کہ کون سے ملک دشمن عناصر نے ۱۹۷۱ء میں بھی کراچی کے اندر خون کی ہولی کھیلی اور لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسایا۔اور سن چھیاسی میں بھی سقوط ڈھاکہ کے بعد کراچی جیسے بڑے شہر اور معاشی حوالے سے اہم شہر کو اسی طرح نقصان پہنچایا جاتا رہا ہے۔ لوگوں کو دکھ کی کیفیت سے گزارا جارہا ہے:

> "چیخ وپکار نیلگوں سمندر مجھے نگلنے کو جھاگ اڑا رہا ہے۔۔۔اس نے مجھے ماضی پرست کہا تھا۔حال کے متعلق اس کا خیال کیا ہو سکتا ہے معلوم نہیں سن اکہتر میں انھیں کس نے حکم دیا۔"(۱۹)

نشاط فاطمہ واحد متکلم کردار "زین" کے ذریعے یہ سوال اٹھاتی ہیں کہ ملک کے اندر جو خون کی ہولی کھیلی گئی،لوگوں پر ظلم ہوا،بچوں کے سروں سے ان کے والدین کے سائے چھین لیے گئے،وہ جو نام سے بے نام ہوئے۔تو اب ان کے دکھوں کا مداوا کون کرے گا؟ان کے زخموں پر مرہم کیسے رکھی جائے گی؟"زین" کا کردار اس سوال کا جواب ڈھونڈتا پھرتا ہے کہ آج معاشرے کے اندر اس شخص کو اہم مقام اور عزت دی جاتی ہے جس کے پاس پیسہ ہوتا ہے۔باقی لوگوں کا معاشرے میں کوئی مقام نہیں ہے۔وہ نام سے بے نام ہو گئے۔ایسے میں ان کے دکھوں کا مداوا ہوتا نظر نہیں آتا:

> "ان تڑپتے بچوں کے زخموں کی کون چارہ گری کرے گا۔اور ان کے ننھے دلوں پر تسلی کے مرہم پھاہے کون کرے گا،کون کس سے کیا پوچھے اور کوئی کیا جواب دے۔"(۲۰)

"انسان کی تلاش" میں سقوط ڈھاکہ کے دوران مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے مغربی پاکستان آنے والے خاندانوں کی کیفیت کو اجاگر کیا گیا جو گہرے رنج اور دکھ میں مبتلا ہیں۔افسانہ "انسان کی تلاش" میں دو خاندانوں کا ذکر ہے جو سقوط ڈھاکہ سے قبل مشرقی پاکستان میں رہتے تھے۔مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہونے کے بعد وہ مغربی پاکستان کی طرف ہجرت کر گئے۔اس ہجرت کے دوران انہیں بہت زیادہ مشکلات پیش آئیں ہیں۔بہت ساری آزمائشوں سے انہیں گزرنا پڑتا ہے۔نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے وطن سے جڑی یادوں کو یاد کرتے ہیں۔انہیں اپنی مٹی سے بہت زیادہ پیار اور محبت ہے۔جس کا وہ وقتاً فوقتاً اظہار کرتے رہتے ہیں۔مشرقی

پاکستان سے مغربی پاکستان ہجرت کرنے والے ان دونوں خاندانوں کے افراد کی دکھ بھری داستان ایک جیسی نظر آتی ہے۔وہ ہر وقت اپنے علاقے کو یاد کرتے رہتے ہیں۔اس علاقے کے اندر گزرے ہوئے وقت اور علاقے کے لوگوں سے جڑی ہوئی یادوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔انھیں امید ہے کہ مستقبل میں حالات بہتر ہونے کی صورت میں وہ واپس اپنے علاقے کی طرف چلے جائیں گئے۔آخر کار وہ ان کا وطن ہے۔اب اور ان میں قوت برداشت نہیں ہے کہ وہ وطن کی مٹی سے دور رہیں۔نازیہ ملک لکھتی ہیں:

> "یہ ہجرت عارضی تھی۔جب حالات بہتر ہو جائیں تو لوگ واپس اپنے گھروں میں آجائیں گے اور حالات معمول کے مطابق ہو جائیں گے۔لیکن یہ صرف لوگوں کا خیال ہی تھا حالات دن بدن تیزی سے بگڑتے چلے گئے اور لوگوں کو مجبوراً ہجرت کرنی پڑی بہت سے لوگوں نے عین وقت پر اتنی جلدی میں گھر بار چھوڑ کر انھیں اپنی جانیں بچانے کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔بہت سے لوگ پیدل قافلوں کی شکل میں ہجرت کرکے پہنچے اور کچھ لٹے پٹے ٹرینوں میں یہاں پہنچے۔انھیں بنیادی مسائل مثلاً خوراک،لباس اور رہائش جیسے مسائل درپیش آئے۔"(۲۱)

افسانہ "انسان کی تلاش" میں اپنوں کے ہاتھوں اپنوں ہی کی زندگی کو لوٹنے والوں کی کہانی نظر آتی ہے۔سقوط ڈھاکہ کے دوران ایک ہی چھتری تلے جمع ہونے والے افراد جن پر لوگوں کو اعتماد تھا جب انھوں نے ان ہی لوگوں کو قتل کیا تو یہ ایک ناقابل فراموش اور حیران کن بات تھی:

> "مگر پھر اس ہاتھ نے مجھے بہت دکھ دیا۔اتھاہ دکھ ابدی دکھ۔دکھ جو دکھائی نہیں دیتا،دکھ جو محسوس نہیں کیا جاسکتا۔"(۲۲)

سقوط ڈھاکہ کے دوران ایک ہی ملک میں محب الوطنی کا دم بھرنے والوں نے اپنوں ہی کو دکھ اور کرب میں مبتلا کر دیا۔جس نے انھیں نفسیاتی حوالے سے پریشانی سے دوچار کر دیا۔امن کسی بھی ملک کے لیے فائدہ مند ہوتا ہے۔اس میں اس کی معاشی اور معاشرتی ترقی کا راز مضمر ہے۔افسانہ "انسان کی تلاش" میں واحد متکلم کے کردار کی صورت میں سقوط ڈھاکہ کے دوران بنگال میں ہونے والی خون ریزی اور بدامنی سے پردہ ہٹایا جاتا ہے۔بنگال کے مسلمان سقوط ڈھاکہ کی وجہ سے ذہنی،سماجی،سیاسی اور اخلاقی حوالے سے انتشار کا شکار

تھے۔ نشاط فاطمہ "واحد متکلم کردار" کے ذریعے سقوط ڈھاکہ کے حالات وواقعات کو پیش کرتی ہیں۔ واحد متکلم کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو اس وقت بنگال میں موجود تھا۔ اس نے کئی زندگیوں کو ٹوٹتے اور بکھیرتے ہوئے دیکھا تھا۔ سقوط ڈھاکہ کی صورتحال بھی لوگوں کے لیے مہلک ثابت ہوئی ہے جس کے اثرات جنگ ختم ہونے کے بعد بھی قائم ہیں۔ واحد متکلم کے کردار نے ان کشیدہ حالات کے دنوں میں لوگوں کی ذہنی پریشانیوں کو بیان کیا ہے۔ ان ذہنی پریشانیوں کی وجہ سے وہ لوگ امن وسکون سے محروم ہوگئے۔ ان کی آنکھوں میں ویرانی آگئی۔ وہ اپنے آپ کو ان حالات کو کنٹرول کرنے اور ملک کو ٹوٹنے سے بچانے میں مکمل طور پر بے بس نظر آئے:

> "زندگی اس طرح ختم ہو جاتی ہے جس طرح کوئی بیکار سا شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر شئے کی حرکت کے معنی ہوتے ہیں۔ تم بھی اس وقت بنگال میں تھے۔ میں نے اور تم نے اس وقت کتنا خون بہتے دیکھا اور کتنی زندگیاں ٹوٹتے۔"(۲۳)

سقوط ڈھاکہ کے دوران بنگال کی صورتحال اس قدر ابتر ہوگئی کہ لوگ انسانوں میں انسان کی تلاش کرنے لگے۔ سقوط ڈھاکہ کے دوران حالات وواقعات کی وجہ سے لوگ گہرے دکھ میں مبتلا ہوگئے۔ اس واقعے کے دوران فسادات اور خون ریزی نے انسانوں کو ایک گہری سوچ میں مبتلا کر دیا۔ جس سے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے نہیں نکل سکتے تھے۔ دکھ ایک منفی سوچ کا نام ہے جو ہر انسانی معاشرے میں ذی شعور اور ذی عقل انسان کو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر مختلف وجوہات کی وجہ سے ضرور ہو سکتا ہے۔ اس درد کی کئی وجوہات ہیں کسی کی فوری ناکامی بھی دکھ کی وجہ بن سکتی ہے۔ کسی مقصد کے لیے کوشش میں ناکامی یا کسی امتحان میں ناکامی کی وجہ سے بھی دکھ ملتا ہے۔ بعض اوقات اپنی قسمت اور مقام کا دوسروں کے مقابلے میں ارضاں ہونے کی وجہ سے بھی دکھ ملتا ہے۔ کسی کی بے عزتی، کسی ناگہانی نقصان، کسی کی بدزبانی اور بدگوئی، ماں باپ یا اولاد کا بیمار ہونا، شادی کے بعد ماں باپ سے الگ ہو جانا وغیرہ دکھ کی اقسام ہیں۔ کچھ دکھ دیرپا ہوتے ہیں اور کچھ دکھوں سے انسان جلد باہر نکل آتا ہے۔ لوگوں کو الغرض جو دکھ پہنچتا ہے اس سے ان کے زخم تازے ہو جاتے ہیں۔ تاہم صبر واستقامت قلب ہی آگے کی زندگی کی ضامن ہے۔

جہاں آرا امام رقمطراز ہیں:

"سارا ملک تحریک آزادی میں مشتعل ہو چکا ہے۔ ہر طرف احتجاج کا طوفان برپا ہے۔ صورتحال کی شدت پر غیر ملکی ملازمین خوف زدہ ہونے لگے ہیں۔ مغربی جرمنی اور برطانیہ کی حکومتوں نے اپنے کچھ شہریوں کو مشرقی بنگال سے ہٹانا شروع کر دیا ہے۔"(۲۴)

واحد متکلم کا کردار سقوط ڈھاکہ کے دوران دکھوں کی ایسی داستان پیش کرتا ہے جس نے انسان کو بکھیر دیا ہے۔ کسی نے اس سانحے میں لوگوں کے اندر چھپے درد کو محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ کسی نے ان کے دکھوں کو بانٹ لینے اور ان کی پریشانیاں کم کرنے کے لیے کوئی اقدامات نہیں اٹھائے۔ سقوط ڈھاکہ کے سانحے نے لوگوں کو ایسی کیفیت میں مبتلا کر دیا جس سے وہ داخلی سطح پر ٹوٹ گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے دکھوں اور پریشانیوں کو اپنے سینے میں دفن کر لیا ہے۔ دفن ہونے کی وجہ سے یہ دکھ اور ان دکھوں سے پہنچنے والے درد کو دیگر لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں۔

"واحد متکلم کا کردار" ایک ایسا کردار ہے جس نے سقوط ڈھاکہ کے حالات واقعات کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس کردار کے ذریعے وطن کی محبت کا دم بھرنے والوں کا پردہ فاش ہوتا ہے۔ صیغہ "واحد متکلم کا کردار" کہتا ہے کہ لوگ نفسا نفسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ زمین سے محبت کا دم بھرنے والوں کی محبت کھوکھلی ہو چکی ہے۔ یہ آنے والی نسلوں کو کیا پیغام دے رہے ہیں۔ واحد متکلم کا کردار انسانی رشتوں کا "برگد" کے اس درخت سے موازنہ کرتا ہے کہ وہ جتنا پرانا ہو جاتا ہے اس کی جڑیں زمین میں پکڑ جاتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس درخت کی خوبی یہ ہے کہ اس کی زمین سے محبت بڑھ جاتی ہیں۔ زمین سے اس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو جاتی ہیں کہ کسی قسم کے حالات، آزمایش، آندھیوں اور طوفانوں میں "برگد" کا درخت سینا تان کر کھڑا رہتا ہے۔ طوفانوں اور مصیبتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ دوسری طرف سقوط ڈھاکہ کے دوران حالات وواقعات اور فسادات کے دوران لوگ اپنی ہی زمین سے رشتہ توڑ بیٹھے تھے۔ حالانکہ اسی زمین کے حصول کے لیے ان کے آباؤاجداد نے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ سقوط ڈھاکہ کے دوران جب ان پر فسادات، قتل وغارت اور حالات کے خراب ہونے

کی آزمایش آئی تو وہ اپنی مٹی سے وفانہ کر سکے مشکل وقت میں وہ اپنے وطن کا ساتھ چھوڑ گئے:

"ہم تو برگد کے اس درخت سے کمزور تھے۔ یہ جتنا بوڑھا ہو جاتا ہے اس کی جڑیں اتنی ہی زمین میں جڑ پکڑ جاتی ہیں۔ ہمارا رشتہ زمین سے کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کا رشتہ زمین سے مضبوط سے مضبوط ہوتا جاتا ہے۔"(۲۵)

"کاظم حسن رضوی" افسانہ "انسان کی تلاش" میں ایک ایسا مرد کردار ہے جس کی موجودگی سامعین کو اپنی جانب توجہ مبذول کرواتی ہے۔ آج کل وہ کراچی میں ہیں۔ ان کی شخصیت کے حوالے سے مشہور ہے کہ وہ دنیا میں اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے دوران ان کے والدین چٹاگنگ سے کراچی آ گئے۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل کام کے سلسلے میں وہ کراچی اور پنجاب کے مختلف علاقوں میں آتے جاتے تھے۔ سقوط ڈھاکہ نے ان کی شخصیت کو بہت متاثر کیا۔ وہ بنگال کی زمین کو بہت یاد کرتے ہیں:

"بنگال چھٹا تو اپنا شیرازہ بکھر گیا۔ ویسے بھی ہر ابھرا دیس تھا۔۔۔ دکھ، خوف اور محبت کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انھوں نے دیکھا تھا۔"(۲۶)

افسانہ "انسان کی تلاش" میں "صنوبر" کے "والد" ایک اہم کردار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ "والد" ایک آزاد ریاست کا تصور لے کر جب بمبی سے چٹاگانگ جاتے ہیں تو یہ زمین ان کی توقعات کے برعکس ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ بنگال کی سرزمین سے شدید محبت کرتے ہیں:

"انسان تو ہو گئے یہاں تو ہر چیز پہیہ ہے۔ کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ پھر وہ میرا وطن ہے۔"(۲۷)

بنگال کی سرزمین میں بسنے والے لوگ وطن کا مطلب جاننا چاہتے تھے۔ ہجرت کے دوران جب فسادات ہوئے تو وہ سوچتے تھے کہ یہ وطن آخر ہے کیا چیز؟ ان حالات کے باوجود بھی "صنوبر" کے "والد" "چٹاگانگ کی زمین سے محبت کرتے تھے۔ اور اس امید سے تھے کہ حالات بہتر ہو جائیں گئے۔

افسانہ "مزدور" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں مرکزی کردار "سید اکمل حسین عرف اکن ماموں" کا ہے۔ مرکزی کردار "اکن ماموں" نے پاکستان بنانے میں بے پناہ جدوجہد کی تھی۔ "اکن ماموں" مسلم لیگ کا سچا خیر خواہ تھا۔ وہ دن رات مسلم لیگ کو کامیاب بنانے کے لیے دل و جان سے کام کرتا تھا۔ وہ قائداعظم سے بہت

زیادہ محبت کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ قائد اعظم کی قیادت میں مسلمان آزاد اسلامی ریاست حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ وہ مسلم لیگ کے جلسوں میں شرکت کرتا اور سیاسی جلسوں میں ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس کے اہل خانہ، محلے دار، رشتہ دار اور دوست احباب ہمیشہ اس پر تنقید کرتے تھے کہ وہ پاکستان کی تخلیق کا کیوں حامی ہے۔ آخر ہندوستان کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے سے مسلمانوں کو کیا فائدہ حاصل ہو گا۔ ان میں سے کچھ لوگ اس کو سمجھاتے کہ وہ تقسیم ہندوستان کی بات نہ کرے۔ ان کا خیال تھا کہ تقسیم سے مسلمانوں کو نقصان ہی نقصان ہو گا۔ وہ متحدہ ہندوستان کے حامی تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ تقسیم کی صورت میں مسلمان مشکلات کا شکار ہوں گئے۔ مسلمانوں کو ہجرت، فسادات، تعصب، معاشی و معاشرتی مشکلات جیسی آزمائش سے طرح طرح گزرنا پڑے گا۔ لیکن "اکن ماموں" کا خواب تھا کہ پاکستان ضرور بنے۔ اگر پاکستان نہ بنا تو مسلمان پست سے پست تر ہو جائیں گئے:

> "اگر پاکستان نہیں بنے گا تو یاد رکھو ہم سب بھنگی چمار بن کر رہیں گئے۔ اس ملک میں ویسے میرا ایمان ہے کہ پاکستان بن کر رہے گا۔"(۲۸)

"اکن میاں" کا کردار ایک ایسا کردار ہے جس کے ذریعے نشاط فاطمہ قیام پاکستان اور سقوط ڈھاکہ کے سانحے کا موازنہ کر کے ایک ایسی تصویر ہمارے سامنے لاتی ہیں کہ قیام پاکستان کے لیے لوگوں کے کس قدر جذبات تھے۔ وہ آزاد ملک کے خواب کو عملی جامعہ پہنانے کے لیے کیسی کیسی قربانیاں دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھیں بہت زیادہ سختیاں اور مشکلات بھی برداشت کرنا پڑیں مگر وہ ثابت قدم رہے:

> "کون سا ایسا جلسہ جلوس ہوتا جس میں وہ شرکت نہ کرتے ہوں۔ ایجی ٹیشن میں ڈنڈے کھاتے۔ چندے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ نیا جوتا بیچ کر مسلم لیگ کے چندے میں دے آئے۔"(۲۹)

افسانہ "مزدور" میں "اکن میاں" جیسے کئی ایسے کردار ہیں جنھوں نے اس پاکستان کے لیے جہاں مسلمانوں کو متحد ہونا تھا، جہاں اسلام کا بول بالا ہونا تھا، جہاں مسلمانوں کو معاشی، معاشرتی اور مذہبی حوالے سے

خوشحال ہونا تھا ایسی ایسی قربانیاں دی ہیں جو نا قابل فراموش ہیں۔ "اکن میاں" نے نئے جوتے تک بیچ کر مسلم لیگ کے چندے میں پیسے دے دیے۔ سختیاں برداشت کیں، ڈنڈے کھائے لیکن ایک مزدور کی حیثیت سے حکمرانوں کے شانہ بشانہ سچے دل سے چلے۔

نشاط فاطمہ سقوط ڈھاکہ کے واقعے کے تناظر میں دکھ اور افسوس کا اظہار کرتی ہیں کہ یہ وہ پاکستان تھا کہ جس کو حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں نے بڑی جدوجہد کی۔ "اکن میاں" جیسے کردار اس پاکستان کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے۔ پاکستان سے محبت کرنے والے ایسے لوگوں نے اپنے نئے جوتوں کو بیچ کر اور اپنا پیٹ کاٹ کر مسلم لیگ کے چندے میں پیسے دے دیے لیکن سقوط ڈھاکہ میں ایک ہی ملک کے مسلمان ہی مسلمانوں کے دشمن ہو گئے اور اپنے ہی گھر کو اپنے ہاتھوں سے توڑ بیٹھے۔ اپنے ملک کے خلاف دشمن کی سازشوں کا شکار ہو گئے۔ حالانکہ اس ملک کی خوشحالی کے لیے "اکن میاں" جیسے کئی کرداروں نے خواب دیکھے تھے کہ یہ ملک مسلمانوں کی پہچان ہو گا۔ لیکن بدقسمتی سے ملک دشمن سازشی عناصر اپنی چال میں کامیاب ہو گئے۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف ایسے ورغلایا گیا۔ مسلمان ایک بار پھر ملک کو تقسیم کرنے کے لیے راضی ہو گئے۔ یہ جدوجہد اس حوالے سے عجیب تھی کہ اس میں مسلمانوں نے مسلمانوں کے خلاف ہی جنگ کی اور اپنے ہی گھر کو اپنے ہاتھوں سے تباہ و برباد کر کے "اکن میاں" جیسے محب الوطن لوگوں کے آرمانوں پر پانی پھیر دیا۔

نشاط فاطمہ افسانہ "مزدور" میں ایک اور تلخ حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ ویسے تو تحریک پاکستان میں بہت سارے لوگوں نے حصّہ لیا اور قربانیاں دیں مگر کچھ ایسے کردار بھی تھے جنھوں نے سچے دل سے ایک مزدور کی حیثیت سے قائداعظم کے شانہ بشانہ کام کیا۔ جلسے جلسوں میں سختیاں برداشت کیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا عملی طور پر ساتھ دیا۔ مگر قیام پاکستان کے بعد بعض وجوہات کی وجہ سے وہ نئے ملک میں نہیں آسکے۔ حالانکہ نئے ملک میں امن وسکون کی زندگی گزارنے کے لیے سب سے پہلے حق ان کا تھا۔ "اکن میاں" ایک ایسا کردار ہے جس نے مسلم لیگ کی خاطر سختیاں برداشت کیں۔ مسلم لیگ کے لیے چندے اکھٹے کیے۔ مسلمانوں کو تحریک آزادی کے لیے تیار کیا۔ نظریاتی محبت دل وجان سے کی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد پاکستان نہیں آسکے۔ حالانکہ ایسے لوگوں کا پاکستان کی سرزمین پر زیادہ حق تھا:

"نہیں بیٹا پاکستان ایک نوخیز ملک ہے۔اس کو جوان اور نئے لوگوں کی ضرورت ہے۔میں بیمار ہوں پاکستان پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔اس وقت پاکستان کو مضبوط، محنتی اور ان تھک کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔میں اتنا کام کہاں کر سکتا ہوں۔"(۳۰)

"اکن میاں" کے کردار کے ذریعے سقوط ڈھاکہ کی دکھ بھری کہانی اجاگر ہوتی ہے۔یہ کیسے محب وطن تھے جنہوں نے اپنے ہاتھوں اپنے ہی گھروں کو لوٹا۔"اکن میاں" جیسے محب الوطن کردار اور ملک سے محبت کرنے والے کہاں گئے۔حالانکہ "اکن میاں" صرف اس وجہ سے پاکستان نہیں آسکے کہ پاکستان کو مضبوط، محنتی اور ان تھک کام کرنے والے نوجوانوں کی ضرورت ہے اور "اکن میاں" بوڑھے اور ضعیف ہیں۔مگر ہمارے نوجوانوں نے ذہانت اور لگن کے باوجود مشرقی حصّہ الگ کر دیا۔شاہد وہ وطن کی اہمیت سے محروم تھے۔

افسانہ "مزدور" کے ذریعے پاکستان سے محبت کرنے والے ایسے افراد کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ جب پاکستان بن گیا تو پاکستان بننے کے بعد بھی وہ مسلمان سچے دل سے پاکستان سے محبت کرتے تھے۔قیام پاکستان کے بعد بھی انھوں نے پاکستان کی سربلندی، عزت اور خوشحالی کے لیے دعائیں کی۔وہ سچے دل سے پاکستان اور اہل پاکستان سے محبت کا دم بھرتے ہیں۔نشاط فاطمہ علامتی انداز میں ایسے لوگوں کا موازانہ ان لوگوں سے کرتی ہیں جو قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے شہری تو بن گئے لیکن انھوں نے ملک کی ترقی میں کوئی حصّہ نہیں ڈالا وہ سچے محب وطن ثابت نہیں ہوئے۔جب پاکستان پر مشکل وقت آیا تو ملک کا دفاع کرنے کی بجائے یہ اپنے ہی ملک کے ٹکڑے کرنے پر تیار ہو گئے۔ملک کے دشمنوں کے ساتھ مل کر اپنے ہی ملک کو دولخت کر دیا۔نشاط فاطمہ نے علامتی انداز میں ایسے لوگوں کے محب وطن ہونے پر سوال اٹھادیا:

"ان دنوں ہندوستان پاکستان کے درمیان کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔میں وہیں تھی کہ پاکستان میچ جیت گیا۔اکن ماموں اپنے بہت سے ساتھیوں کو لے کر سجدہ میں شکرانے کے نفل پڑھنے لگے۔جس روز پاکستان میچ جیتا اور اکن ماموں نفل پڑھنے لگے اس کے دوسرے دن ڈپٹی کمیشنر نے انھیں یاد فرمایا۔"(۳۱)

پاکستان بننے کے بعد دنیا بھر میں بالخصوص بالعموم اور ہندوستان میں پاکستان سے محبت کرنے والے موجود ہیں۔یہ لوگ دلوں وجان سے ترقی کے خواہاں ہیں۔حتی کہ پاک بھارت کرکٹ میچ جیسے کھیل میں

پاکستان کی جیت کے خواہاں ہوتے ہیں۔ پاکستان کی جیت کی خوشی میں اللہ کے حضور شکرانے کے نفل ادا کرتے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان کے اندر بھی مسلمانوں کا روپ دھار کر ایسے مسلمان بھی ہیں جن کی وجہ سے ملک مشرقی اور مغربی پاکستان میں بٹ گیا۔ ان لوگوں نے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دی۔ ملک کی خوشحالی اور بہتری کی بجائے ملک دشمن سازشی عناصر کا ساتھ دیا۔ سقوط ڈھاکہ کی وجہ سے انھوں نے اپنوں کو ایک دفعہ پھر ہجرت در ہجرت پر مجبور کر دیا۔

افسانہ "ایک پتہ" میں سقوط ڈھاکہ کے دوران اور سقوط ڈھاکہ سے قبل کے حالات کی تصویر کشی ملتی ہے۔ افسانہ "ایک پتہ" میں "دارا" کا کردار اہم کردار ہے جو ایک ایسا فوجی آفیسر ہے جس کی کہانی سقوط ڈھاکہ سے قبل کے حالات وواقعات، مشاہدات کی عملی تصویر کے طور پر نظر آتی ہے اور سقوط ڈھاکہ کے دوران اور بعد کی عملی تصویر پیش کرتی ہے۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل اور بعد کے حالات نے ملک کے دیگر شہریوں کے ساتھ ساتھ افواج پاکستان میں شامل فوجی جوانوں کی زندگیوں پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اس سانحے نے ملک کے دیگر لوگوں کی طرح خاص کر ان فوجی جوانوں کو داخلی اور خارجی حوالے سے شدید متاثر کیا جو وطن عزیز کی حفاظت کی خاطر اپنا تن من دھن قربان کرنے کے لیے دن رات پیرا دے رہے تھے۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل اور بعد کے حالات نے فوجی جوانوں کی زندگیوں کو بری طرح متاثر کیا۔

افسانہ "ایک پتہ" میں ایک فوجی نوجوان "دارا" کی زندگی کی کہانی ہے۔ اس کہانی کے کردار کے ذریعے سے سقوط ڈھاکہ سے قبل اور بعد کے حالات واقعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس افسانے میں "دارا" اور اس کے گھر والوں کی زندگی پر سقوط ڈھاکہ کے واقعے کے اثرات کی تصویر کشی ملتی ہے۔

"دارا" ایک ایسا نوجوان ہے جس کے "ابا" فوج میں کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ایک آرمی آفیسر بنانا چاہتے تھے۔ ابا کی خواہش پر "دارا" فوجی کمیشن آفیسر بھرتی ہو گیا اور فوج میں خدمات سرانجام دینے لگا۔ "دارا" نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے حالات کو بڑے قریب سے دیکھا۔ ان دونوں جنگوں میں اس نے شمولیت اختیار کی۔ ان حالات وواقعات کا "دارا" کی زندگی پر بہت اثر ہوا۔ "دارا" اپنے دکھ اور درد کی کہانی بیان کرتا ہے کہ اسے کپتان بنے ہوئے ابھی چند عرصہ ہی ہوا تھا کہ سقوط ڈھاکہ کا واقعہ رونما ہو گیا۔ سقوط

ڈھاکہ کے واقعے کے دوران بحیثیت کپتان اسے مشرقی پاکستان کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ یہ وہی زمین تھی جہاں پر مسلمان آپس میں ہی ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے تھے۔ حالات آئے روز خراب ہو رہے تھے۔ اسے چاروں طرف موت نظر آ رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ہی متحدہ ملک کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنے والے لوگ ایک دوسرے کے خلاف کیسے ہو گئے، اپنے اپنوں کا گلہ کیوں کاٹ رہے ہی، ہر طرف خون کی ندیاں کیوں بہ رہی ہیں وہ اس قدر پریشان تھا کہ اس دوران اس کو اطلاع ملی کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے اور پھر کچھ عرصہ بعد والد کے انتقال کی خبر ملی۔ وہ چاہنے کے باوجود ماں باپ کے جنازے میں نہ جا سکا۔ اس چیز نے اسے گہرے صدمے سے دوچار کر دیا۔ وہ سوچتا ہے کہ بچے کی پیدائش سے لے کر قبر تک ماں باپ کی زندگی سب سے اہم ہوتی ہے۔ ماں باپ بچے کا مستقبل اس لیے روشن کرتے ہیں تاکہ ان کا بچہ قدموں پر کھڑا ہو کر کمزوری میں ان کا بازو بن سکے۔ ماں باپ نے کمیشن آفیسر بننے کے لیے اس پر بچپن سے ہی سخت پابندیاں لگائیں، غصہ کیا اور ڈانٹا۔ جب وہ آج ان کی محبت کی بدولت کامیابی کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہے تو کیسی قیامت خیز گھڑی ہے کہ وہ چاہا کر بھی ماں باپ کی آخری رسومات میں شامل نہیں ہو سکا۔ اس کا دل بری طرح سے ٹوٹ گیا ہے۔ وہ ایک زندہ لاش بن گیا ہے۔ افسانہ "ایک پتہ" میں ملکی حالت کی سنگینی کے باعث سقوط ڈھاکہ کے دوران مشرقی محاذ پر ڈیوٹی دینے والے ایک فوجی آفیسر کی دکھ بھری داستان کو اپنے افسانے کی زینت بنایا گیا ہے۔

> "ابھی کمیشن ملا تھا کہ اماں کا انتقال ہو گیا۔ مجھے کپتان بنے ہوئے چند مہینے ہوئے تھے کہ ہمیں مشرقی پاکستان کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ وہاں اطلاع ملی کہ ابا بھی ختم ہو گئے۔ معلوم نہیں کہ جنگ کیوں لڑی جاتی ہے۔ میرے چاروں طرف اتنی موت تھی لیکن اس کے باوجود میں ایک لمحہ کو بھی اپنے ماں باپ کی موت کے غم کی شدت کو فراموش نہ کر سکا۔"(۳۲)

اس افسانہ میں وطن کے دفاع کی خاطر فریضہ سرانجام دینے والے فوجی جوانوں کی دکھوں کی داستان بیان کی گئی ہے مشرقی پاکستان سے قبل ملک دشمن سازشی عناصر کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے نفرت

کرنے لگے۔ اپنے ہی اپنوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ مسلمان مسلمانوں سے نفرت کرنے لگے۔ لاکھوں بے گناہوں کا قتل کیا گیا الغرض دلوں سے دل جدا ہو گئے۔ پاکستان کو دولخت کرنے میں تو بہت سارے لوگوں نے اپنا کردار بخوبی ادا کیا۔ لیکن شکست در حقیقت صرف اور صرف ملک اور قوم کے حصّے میں آئی:

"ہاں وہ کھلا ہی رہتا ہے۔ بند دروازے تو دلوں کے چھوٹے پن کا اظہار کرتے ہیں۔۔۔ میں بھی یہی سوچتا تھا کہ لوگوں کے دروازے بڑے ہو گئے ہیں اور دل چھوٹے۔"(۳۳)

کسی ایک کو قصور وار نہیں سمجھا جا سکتا۔ جہاں ملک کے اندر محب وطن کا دم بھرنے والے لوگوں نے اپنے ہی لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ وہاں مشرقی پاکستان کے اندر بھی بنگالیوں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔ ملک دشمن عناصر کے ساتھ مل کر بنگلہ دیش کے قیام کے لیے بھرپور ساتھ دیا۔

سقوط ڈھاکہ کے دوران افسانہ "ایک پتہ" میں اس سانحے کے دوران قید ہونے والے جنگی قیدیوں کی دردناک کہانی کی بھی تصویر کشی ملتی ہے۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاک فوج نے شدت پسندوں کے خلاف آپریشن شروع کیا۔ جس کے نتیجے میں گوریلا اور تربیت یافتہ فوجیوں نے عسکری کاروائیوں کا آغاز کر دیا۔ اس دوران انھوں نے فوجی جوانوں اور وفاق پاکستان کے وفادار عناصر کو چُن چُن کر قتل کر دیا اور قیدی بنا دیا۔ اس مارچ سے سقوط ڈھاکہ کے دوران بھارت نے بھرپور انداز میں مکتی باہنی اور دیگر گروہوں کو افواج پاکستان کے خلاف استعمال کیا۔ اس نے عسکری، مالی اور سفارتی مدد بھی فراہم کی۔ جب دسمبر میں مشرقی پاکستان کی حدود میں بھارت گھسنے میں کامیاب ہو گیا تو اس وجہ سے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں افواج پاکستان ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی۔ بہت سے فوجی جوانوں کو قید کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد جنگی قیدیوں کی تعداد کے حوالے سے ہتھیار ڈالنے کی یہ ایک بڑی کاروائی تھی۔ سقوط مشرقی پاکستان کے نتیجے میں پاکستان رقبے اور آبادی دونوں سے بلاد اسلامیہ کی سب سے بڑی ریاست کا اعزاز حاصل نہ کر سکا۔ افسانہ "ایک پتہ" میں "دارا" فوجی آفیسر کے کردار کے ذریعے سقوط ڈھاکہ کے سانحے میں قید ہونے والے فوجی نوجوانوں کی دردناک کہانی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس میں یہ منظر کشی کی گئی ہے کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد کس اذیت ناک انداز میں فوجی

جوانوں کو بے دردی سے قید کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا:

"اس کے بعد سے مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کچھ بھول گیا ہوں۔ دو سال جنگی قیدی رہا
ایک وقت گزر گیا۔ جب میں واپس آیا دنیا بدل چکی تھی۔"(۳۴)

جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں۔ قیام پاکستان کے بعد بھی بھارت نے پاکستان کو مستحکم نہیں ہونے دیا۔ سقوط مشرقی پاکستان کے اندر جہاں فوجی نوجوان اندرونی جہالت کا مقابلہ کر رہے تھے وہاں ملک کے اندر ان کی ذاتی زندگی بھی متاثر ہوئی تھی۔ شکست کی وجہ سے فوج نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ بہت سارے علاقوں پر دشمن نے قبضہ کر لیا تھا۔ فوجی نوجوانوں کو قید کر کے ان پر تشدد کیا گیا۔ انھیں طرح طرح کی جسمانی تکلیفیں دی گئیں۔ بے دردی سے انہیں مارا پیٹا گیا۔ ان تکالیف کی وجہ سے بہت سارے فوجی نوجوان اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ کچھ فوجی جوان تشدد سے شہید کر دیے گئے۔ بچ جانے والے فوجی جوانوں میں سے اکثریت ان کی تھی جو یا تو نیم پاگل تھے یا وہ ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے۔ نشاط فاطمہ نے فوجی آفیسر "دارا" کے کردار کے ذریعے سانحہ سقوط ڈھاکہ میں قید پاکستانی فوجیوں کی روداد سنائی ہے۔ کہ "دارا" جو کہ ایک فوجی آفیسر تھا سانحہ مشرقی پاکستان کے دوران دو سال قید رہا۔ قید و بند کی سختیاں اور تکلیفیں برداشت کرنے کی وجہ سے "دارا" نفسیاتی مسائل کا شکار ہو گیا۔ اسے ہر وقت ایسا لگنے لگا جیسے وہ خوف کے اندھیرے میں قید ہے۔ اگر کمرے کی کھڑکی بند بھی کر دی جاتی تو اسے ایسا لگتا جیسے وہ پھر سلاخوں کے پیچھے اندھیری کوٹھری میں قید کر دیا گیا ہو۔ وہ ہر وقت خوف اور ڈر کا شکار رہتا:

"چند لمحے وہ چپ کر کے بیٹھا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر کوئی بوجھ ہو۔ اور جس
کی وجہ سے وہ اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا اندر آیا
جس سے وہ پتے کی طرح کانپ سا گیا۔"(۳۵)

سانحہ مشرقی پاکستان میں فوج کے ہتھیار ڈالنے کی خبر کے ساتھ ہی جیلوں کو پاکستان کی حمایت کرنے والوں اور فوجی جوانوں کو قید کر کے بھر دیا گیا۔ نشاط فاطمہ نے "دارا" کے کردار کے ذریعے قیدیوں کے جذباتی اور نفسیاتی کیفیت کو اجاگر کیا ہے جس سے قاری کی آنکھیں نیم ہو جاتی ہیں:

"ایک بار جب آدمی جنگ کے تجربے سے گزر جاتا ہے تو وہ پہلے جیسا انسان نہیں
رہتا۔ اس میں ایک ایسی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جسے عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اپنے

اندر کی کیفیت کو میں محسوس کر سکتا ہوں۔ بیان نہیں کر سکتا۔ جنگ کے بعد ایک فوجی میں شدت احساس ختم ہو جاتا ہے۔ زندگی اور موت دونوں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔"(۳۶)

افسانہ "آج کے غم کے نام" میں سقوط ڈھاکہ سے جڑی ہوئی ایسی یادوں کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں بنگال میں سیاسی، معاشی معاشرتی اور ثقافتی زندگی کا رنگ نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں قوم کے نام پیغام موجود ہے کہ اپنے اور پرائے کی تمیز سیکھ لی جائے۔ ایسی تمام قوتوں کو ختم کر دیا جائے جو ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیں۔ جب ملک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر تباہی کے دہانے پر کھڑا بھی ہو جائے تب بھی مٹی سے وفا کی جائے۔ مشکل وقت میں اپنے مفاد کی خاطر اور اپنے حالات کی بہتری کی خاطر ملک اور اس کے باشندوں کو بے یارو مددگار نہ چھوڑا جائے۔ اللہ کی نعمتوں پر شکر بجالایا جائے۔ خاص کر دیہاتوں کے اندر لوگوں کے مسائل کو سمجھ کر مشکل وقت میں ان کی مدد کی جائے۔ اس وقت مشرقی پاکستان کے دیہات مغربی پاکستان کے دیہاتوں سے تعلیمی اور معاشی امور میں بہت پیچھے تھے۔ بقول عنایت اللہ:

"جنگ میں حیران کن واقعات رونما ہوتے ہیں۔ معجزے بھی ہوتے ہیں۔ مگر جنگ کی لپیٹ میں جب نہتے شہری اور دیہاتی آجاتے ہیں تو بڑے ہی شرمناک اور بڑے ہی دردانگیز حادثے ہوتے ہیں۔"(۳۷)

افسانہ "آج کے غم کے نام" میں "عابد حسین" ایک ایسا کردار ہے جس کا خاندان قیام پاکستان سے قبل آلہ آباد میں مقیم تھا۔ "عابد حسین" اور اس کے خاندان والے قیام پاکستان کے حامیوں میں سے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ وہ بھی پاکستان جائیں۔ جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو وطن کی محبت کی خاطر انھوں نے آلہ آباد میں اپنے گھر بار کو چھوڑ کر پاکستان کی طرف ہجرت کی۔ وہ آلہ آباد سے ڈھاکہ آکر مقیم ہوئے۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل جب بنگال کے حالات خراب ہونے لگے تو اس دوران وہ بہت زیادہ پریشان ہوئے۔ بنگال کی زمین پر وہ پلے بڑھے تھے۔ اسی سرزمین کے لیے انھوں نے بنگال سے ہجرت بھی کی تھی۔ سیاسی اور سماجی حوالے سے بھی بنگال کی فضا ناسازگار تھی۔ موسمی حوالے سے بھی برسات کے دنوں میں خوب بارشیں ہوتیں۔ بارشوں اور طوفانوں کی وجہ سے ہر طرف افراتفری مچ جاتی۔ "عابد حسین" بنگال کے حالات سے بہت تنگ آگیا۔ وہ آئے

روز یہاں سے جانے کے بارے میں سوچنے لگا کہ کب ایسا موقع آئے اور وہ کسی پر امن اور خوشحال علاقے کی طرف ہجرت کر جائیں۔ اس طرح وہ بنگال کے حالات سے اکتاہٹ کا شکار ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد آلہ آباد سے بنگال کی طرف ہجرت ان کے لیے تلخ ثابت ہوئی۔ وہ اس ہجرت سے سخت پریشان ہوئے۔ افسانہ "آج کے غم کے نام" میں "عابد حسین" کے کردار کے ذریعے سقوط ڈھاکہ سے قبل بنگال کے حالات کی تصویر کشی کی ہے کہ بنگال کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالت "عابد حسین" کو راس نہ آئے۔ انھوں نے اپنے افسانے کے اندر آلہ آباد سے ہجرت کرنے والے ایک ایسے خاندان کی کیفیت بیان کی ہے جو ہجرت کے بعد ایک اور ہجرت کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو گیا:

> "جو یہ لوگ یعنی عابد حسین اور ان کی بیگم سکینہ آلہ آباد سے چلے تو ڈھاکہ میں آکر دم لیا۔۔۔ یہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ پانی برستا ہے تو برستا ہی چلا جاتا ہے۔ کیا قیامت کی برساتیں ہوتیں ہیں۔ سال کا کون سا دن ایسا ہوتا ہے کہ بارشوں اور طوفانوں کی افراتفری نہ ہو۔"(۳۸)

افسانہ "آج کے غم کے نام" میں نشاط فاطمہ نے "سجاد" کے کردار کے ذریعے سقوط ڈھاکہ سے قبل اور سقوط ڈھاکہ کے بعد ایسے لوگوں کی بھی عکاسی کی ہے جن کو دل وجان سے پاکستان سے محبت تھی۔ جو مشکل وقت میں لوگوں کے کام آنا چاہتے تھے۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل اور سقوط ڈھاکہ کے بعد جہاں مغربی پاکستان کا امن وسکون خراب ہوا وہاں مشرقی پاکستان میں بھی لوگ محرومیت کا شکار ہوئے۔ ان لوگوں کو معاشی اور سیاسی ابتر حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود اور آزمائش کی گھڑی میں کچھ لوگ ایسے تھے جو ڈٹ گئے اور ثابت قدم ہو کر ملک کی مشکلات کم کرنے کی کوشش کی۔ "سجاد" ایک ایسا کردار ہے جو "عابد حسین" کا بیٹا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جب اس کے والدین بنگال آکر آباد ہوئے تو اس کی پیدائش بھی بنگال میں ہوئی یہیں اس کا بچپن گزرا تھا۔ اس کی یادیں اس زمین سے جڑ گئیں۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل جب حالات خراب ہونے لگے تو اس کے والدین جو آلہ آباد سے ڈھاکہ آئے تھے وہ ڈھاکہ سے کراچی جانے کو تیار ہوئے۔ انھوں نے "سجاد" کو بھی کراچی اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اصرار کیا مگر "سجاد" نے ان کی بات نہیں مانی اور ان کے

ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے "سجاد" کو بہت سمجھایا کہ یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ یہاں کچھ بھی نہیں رکھا۔ اس جگہ رکنے کا مطلب صرف اور صرف اپنی تباہی ہے۔ "سجاد" کو اپنی سرزمین سے بہت محبت تھی۔ نشاط فاطمہ نے مشکل کی اس گھڑی میں "سجاد" کے کردار کے ذریعے اپنے وطن کی مٹی سے محبت کرنے والوں کی اس طرح تصویر کشی کی ہے:

"یہ میرا دیس ہے۔ میں اتنا بڑا نہیں ہوا ہوں۔ ہاں یہاں رکھا تو کچھ نہیں۔ سوائے ہرے بھرے جنگلوں اور دکھ کے۔"(۳۹)

بنگالی نوجوان مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سیاست دانوں اور آفیسروں کے ناروا سلوک سے آئے روز بد دل ہو گئے۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل ہی ان کے روائیوں سے علیحدگی کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔ افسران کا رویہ عوام کے ساتھ بہت تلخ رویہ تھا۔ اس سے لوگ زمانہ کی جیل میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ اس ظلم و ستم سے تنگ آکر لوگوں نے ہجرت میں ہی عافیت جانی۔ لیکن ایسے حالات کے اندر "سجاد" جیسے کردار کا ثابت قدم رہنا ایک حیران کن عمل ہے:

"آخر حالات خراب ہوں تو وطن کو چھوڑ دینا چاہیے؟ اس نے بوجھی سی آواز سے سوال کیا۔"(۴۰)

۱۹۷۱ء کے انتخابات نے مشرقی پاکستان کے اندر لاقانونیت کے فروغ کا پیغام دیا۔ ان انتخابات کے بعد اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ مغربی پاکستان کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں بغاوت بہت حد تک بڑھ گئی۔ حکومت نے فوج کے ذریعے بغاوت روکنے کی کوشش کی تو ہر طرف افواہوں کا بازار گرم ہو گیا۔ اس کے علاوہ شر پسندوں نے بنگالی عوام کو پاکستانی افواج کے سامنے لا کھڑا کیا۔ بنگالی اپنی فوج کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ایسے میں بہت سارے لوگ ڈر اور خوف کی وجہ سے نقل مکانی کرنے لگے۔ ان حالات میں بہت سارے لوگوں نے "سجاد" کو بنگال چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ مگر "سجاد" ثابت قدم رہا:

"تم کیوں نہ گئے بھائی سجاد میاں۔ برا نہ مان تم نے سی ایس پی کر کے مٹی میں ملا دیا۔ ہم تو استاد خود اس بنگال کے حال سے عجز و بیزار ہیں۔ یہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔"(۴۱)

نشاط فاطمہ نے "سجاد" کے کردار کے ذریعے احسن انداز میں تصویر کشی کی ہے کہ اس کی سوچ اس نقطے

پر آکر رک گئی تھی کہ مصیبت میں مل بیٹھ کر مسئلے کا حل نکالنا ناگزیر ہے۔ اس نے مشکل وقت میں بھی اپنوں کی خدمت کا سلسلہ جاری رکھ کر محب وطن ہونے کا ثبوت دیا۔

تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان کی افرادی قوت کا زیادہ تر حصّہ دیہاتوں میں آباد تھا۔ مزدوروں کے حالات اس وقت بھی انتہائی ہولناک تھے۔ ان کا زیادہ تر پیشہ زراعت تھا۔ ملک کی آمدنی کا زیادہ تر حصّہ ان دیہاتوں سے ہی حاصل ہوتا تھا۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل اور بعد میں بنگال کی عوام کی حالت زار انتہائی کرب آمیز ہو گئی۔ نشاط فاطمہ نے اس کی تصویر کشی کی ہے:

> "اب گاؤں جا کر رہوں گا۔۔۔ ابا کی تھوڑی سی زمین ہے اس پر دھان بوؤں گا اور کاٹوں گا۔ وہاں کی زمین پر ایک کتاب لکھوں گا۔ خالی وقت میں کسانوں کو پڑھاؤں گا اور کوشش کروں گا کہ ان کا معیار بلند ہو جائے۔"(۴۲)

سقوط ڈھاکہ کے دوران مشرقی پاکستان کے دیہاتوں کے اندر بسنے والے افراد کی زندگی انتہائی کھٹن ہو گئی تھی۔ بنگالی حکمران طبقہ بھی سماج کو برباد کرنے والے کسی بھی مسئلے کو حل کرنے میں مکمل طور پر ناکام نظر آیا۔ ایسے وقت میں "سجاد" کا کردار ایسا کردار تھا جس نے مشکل کے اس دور میں بھی مشرقی پاکستان کے دیہاتوں کے اندر بسنے والے افراد کی مشکلات کم کرنے کے لیے حامی بھر لی۔ حالانکہ ان دیہاتوں کے اندر کسی قسم کی سہولت نہیں تھی:

> "اس میں شک نہیں یہاں زندگی کا دستور انتہائی انوکھا اور دشوار کن تھا۔ نہ بجلی تھی اور نہ نل کا پانی تھا۔ سمینٹ کے فرش پر بانس کی چٹائی کا گھروندہ کھڑا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس نے کتاب لکھنی شروع کی۔"(۴۳)

قیام پاکستان کے بعد صوبائی حکومت نے مشرقی پاکستان کے دیہاتوں کے لوگوں کی زندگی بہتر کرنے کے لیے کوئی خاطر خواہ اقدامات نہیں اٹھائے۔ وہ بنیادی ضروری سہولتوں سے بھی محروم تھے۔ صوبائی بجٹ کا کوئی خاطر خواہ بحٹ ان پر نہیں لگایا تھا۔ سقوط ڈھاکہ کے دوران جب حالات بہت زیادہ خراب ہوئے تو مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کی صورتحال صاف صاف نظر آرہی تھی۔ کچھ لوگ تو ہجرت کر گئے مگر "سجاد" ثابت قدم رہا۔ اسے امید تھی کہ ہو سکتا ہے کہ مستقبل کے اندر حالات بہتر ہو جائیں گئے۔ اس امید کی بنا پر وہ ثابت

قدم رہااور دیہاتوں کے اندر لوگوں کی مشکلات کم کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرتا رہا:

"ایک نیا سورج دھان کت کھیتوں پر چمکے گا۔ نیا انسان جو خوشحال اور مضبوط ہو گا وہ اسی دھرتی سے ابھرے گا۔ سنہرا سنہرا دھان کھلیانوں میں بھر جائے گا۔"(۴۴)

سقوط مشرقی پاکستان کے دوران پاکستان کے حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے حالات کی خرابی کی وجہ سے بہت سارے لوگوں نے ملک چھوڑ دیا تھااور کچھ لوگوں نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف ہجرت کی۔ ایسے میں ضرورت اس امر کی تھی کہ ملک کے لوگوں کی مدد کی جائے۔ ایسے میں "سجاد" کا کردار ایک ایسا کردار ہے جس نے اس مشکل وقت میں بھی لوگوں کی مدد کی۔ ان کو دوائیں پہنچائیں۔ کمزوروں اور بے سہاروں کا سہارا بنااور ثابت قدم رہا:

"مگر وہ نہ گیااور اپنی ادھوری کتاب کے اوراق کلیجے سے لگائے رہا۔۔۔ مزے کی بات یہ تھی کہ کس قیامت میں وہ خود بھی موجود رہا اور کتاب بھی۔۔۔ مصروفیت بڑھ گئی۔ کھیتی باڑی کسانوں کو پڑھانے اور اندر گھنے جھنڈوں میں دوائیں پہنچانے میں لکھنے کا وقت نہ ہونے کی وجہ سے کتاب کپڑے میں لپیٹ کر صندوق میں رکھ دی گئی تھی۔"(۴۵)

نشاط فاطمہ نے "سجاد" کے کردار کے ذریعے ایسے لوگوں کی نشاندی کی ہے کہ جو چاہا کر بھی اس ملک کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ یہ بنے تو اس ملک کی مٹی سے بنے تھے لیکن وطن کی محبت میں وہ اس قدر کھو گئے تھے کہ مٹی خود انہیں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ نشاط فاطمہ ایسے محب وطن لوگوں کو خراج تحسین پیش کرتی ہیں۔

۱۹۷۱ء کے دوران وسوسوں اور اندیشوں میں لوگ مبتلا ہو گئے تھے۔ تعصب کی آگ پھیل چکی تھی۔ زندگی کا دائرہ تنگ ہونے لگا تھا۔ لوگ تذبذب کا شکار ہو گئے تھے۔ ایسے میں مجبور ہو کر خاندان کے خاندان نہ چاہتے ہوئے بھی بے گھر ہو گئے تھے۔ بے بس خاندان ان حالات کی وجہ سے ذہنی اذیت کا شکار ہو گئے تھے:

"کبھی کبھی وہ اس سے بیزار ہو جاتا۔ یوں کہ وہ ۱۹۷۱ء کے بعد سے شدید ڈپریشن میں پڑ گیا تھا۔ بہت زیادہ سوچنے لگا تھا۔"(۴۶)

۱۹۷۱ء کے سانحے نے ملک کو توڑ دیا تھا۔ اس دوران زندگی ہر لمحہ تغیر پذیر تھی اور حالات پر انسان کے اختیار نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایسے لگ رہا تھا کہ وہ حالات کے دھارے میں بہتے چلے جا رہے تھے۔ وہ بے شناخت اور بغیر منزل کے سفر کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس سے قبل ۱۹۴۷ء کے دوران بھی یہ لوگ اداسی میں مبتلا ہوئے تھے۔ نشاط فاطمہ نے "سجاد" کے کردار کے ذریعے انسانوں کی اس حالت کو بیان کیا ہے جو ۱۹۷۱ء کے حالات کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ان کا موضوع ایسے انسان کی دکھ کی کہانی بیان کرتا ہے جو دربدر ہو کر اپنا ٹھکانہ کھو چکے ہیں۔ سانحہ ۱۹۷۱ء نے ان کو ذہنی اذیت سے دوچار کر دیا:

"مگر وہ نہ مانا۔ اس نے اس سے کہا۔ میں اپنے دیس کے کسانوں اور ان کے لاغر مویشوں کو ڈوبتے نہیں چھوڑ سکتا۔ تمہیں یاد ہے مجھ پر ۱۹۷۱ء بھی گزر گیا تھا۔ ہاں مگر تم میری کتاب لیتی جاؤ اور اپنے گھر کے کسی فالتو دراز میں بند کر دینا۔"(۴۷)

۱۹۷۱ء کی جنگ کی ناکامی کے بعد پاک فوج نے بھی اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ اس سے تمام قوم کے سر ندامت سے جھک گئے تھے۔ درحقیقت مشرقی اور مغربی پاکستان میں ملک دشمن عناصر نے اس قدر آگ لگائی تھی کہ یہ لوگ آپس میں ہی ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نفرت بتدریج بڑھتے بڑھتے تحریک کی صورت اختیار کر گئی نتیجہ علیحدگی کی صورت میں نکلا۔ "سجاد" نے اس مشکل میں لوگوں کو اکیلا نہیں چھوڑا۔

سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں ملک کے ماحول کی مجموعی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے۔ ۱۹۷۱ء کے دوران حالات اس قدر کشیدہ ہو گئے کہ ملک کے اپنے باشندوں کی اپنے ہی ملک میں کوئی شناخت نہیں رہی۔ کسی کو نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اسی سرزمین کے بیٹے ہیں۔ لوگوں کی جذباتی کیفیت بھی اپنوں کے خلاف نفرت کا باعث بنی:

"دو آبی ندی نالوں گھاٹوں کا پانی سروں سے اونچا ہوتا گیا۔ آدمی تنکوں کی طرح بہتے چلے گئے۔ وہی جس نے دنیا مسخر کی اور حکمرانی کی۔ وہ ۱۹۷۱ء تھا یہ ۱۹۸۵ء ہے۔ کل اور آج اور آج اور کل وقت کا پہیہ آج پر منجمد ہو گیا۔"(۴۸)

ملک میں موجود لوگوں کی ذہنی کیفیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بنگالی اور غیر بنگالی تقسیم نے انہیں مشکوک وشبہات اور ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ بنگالی اپنی تہذیب وثقافت کو متحدہ پاکستان سے بہتر سمجھتے تھے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد بھی ۱۹۸۵ء تک اور اس کے بعد بھی ان کے خیالات اسی طرح ہیں۔

افسانہ "آج کے غم کے نام" میں "انور" کے کردار کے ذریعے نئی تصویر سامنے آتی ہیں۔ "انور" ایک ایسا کردار ہے جو سقوط ڈھاکہ سے قبل مشرقی بنگال میں رہتا تھا۔ وہ خود تو عیش وآرام کی زندگی گزار کر مشرقی پاکستان کی سرزمین سے فائدہ اٹھا رہا تھا لیکن اس نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو اپنے ہی ملک سے ہجرت کا مشورہ دیا۔ وہ کہتا تھا کہ بنگال بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ بنگال میں صوبائی حکومت نے ہمارے حالات بدلنے کے لیے کیا کیا ہے۔ منفی سوچ سے وہ اپنے ہی ملک کے لوگوں کو اپنوں ہی کے خلاف اکساتا اور نفرت کا زہر گھولتا رہا اس افسانے میں "انور" کے کردار کے ذریعے ایسے لوگوں کے حقائق سے پردہ اٹھایا گیا ہے جنہوں نے ملک کے دونوں حصّوں سے خود تو فائدہ اٹھایا ہے مگر دوسروں کو امن وسکون اور بہتر مستقبل کی تلاش کے لیے دوبارہ ہجرت اور نفرت کے لیے اکسایا ہے:

> "کراچی میں تو نوکر کے نام کا چڑیا کا بچہ بھی نصیب ہو جاتا تو لوگ اپنے کو شاد کام سمجھتے تھے۔ یہ تو بنگال ہی تھا جہاں ان کی کھپت ہو گئی۔"(۴۹)

سقوط ڈھاکہ کے دوران استحصال کرنے والے اپنے ہی ملک کے لوگ تھے۔ وہ اپنے رویوں سے لوگوں کو دوبارہ ایک نئے عذاب کو جھیلنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ امن وسکون کی تلاش میں کچھ لوگ مشرقی پاکستان آئے تھے اور جانی اور مالی قربانیاں دے کر اپنا آبائی وطن چھوڑ کر آباد ہوئے تھے۔ اس دوران اسی مٹی سے فائدہ اٹھانے والے باشندے اپنے ہی لوگوں کو اپنے ہی ملک کے خلاف ورغلا رہے تھے۔ حالانکہ اس مٹی نے ان باشندوں کی زندگیوں کو بدلا تھا۔ وہ خود تو ہجرت نہیں کرنا چاہتے تھے مگر دوسرے لوگوں کو اس مٹی سے نفرت دلاتے تھے:

> "اگر یہ رہنے کی جگہ نہیں ہے تو آپ بستے کیوں؟ ارے بھیا ہمیں تو انیس سو سینتالیس ۱۹۴۷ء نے مارا۔ انہوں نے اپنے پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔"(۵۰)

نشاط فاطمہ "انور" کے کردار کے ذریعے ایسے لوگوں کی نشاندہی کرتی ہیں جو محب الوطن، قوم پرست اور جمہوریت پسندوں کے روپ میں سامنے موجود تھے اور ملک کے سیاہ وسفید کے مالک بنے ہوئے تھے۔ مگر وہ دل سے ملک کی ترقی، خوشحالی اور امن وسکون کے خلاف تھے۔ ایسے ہی لوگوں نے خود فائدہ اٹھا کر راستوں میں کانٹے بچھانے کا کام کیا۔

"انور" کا کردار قیام پاکستان کے وقت اچھے مستقبل کی خواہش لے کر پاکستان آیا۔ ان میں "انور" جیسے اور بھی لوگ موجود تھے۔ جب سیاسی حالات تیزی سے بدلنے لگے اور ملک میں انتشار کی حالت پیدا ہوگئی تو "انور" جیسے کئی لوگوں نے معاشی حوالے سے اپنے آپ کو مضبوط کر لیا مگر اس کے باوجود بھی وہ ملک کے خلاف نفرت پھیلاتے رہے:

> "انور صاحب آپ ناشکری کرتے ہیں۔ آپ نے یہاں ایک بزنس شروع کیا اور کتنا چمک رہا ہے۔ کیسی شاندار کوٹھی بنوائی ہے اور ریشم کے تھان جیسی گاڑی خریدی۔ یہ سب کچھ آپ کو یہیں عطا کیا گیا۔ آپ کے پیروں میں بیڑیاں کس نے ڈالی ہیں۔ نہ رہیئے۔"(۵۱)

جو لوگ ہجرت کے دوران مشرقی پاکستان آباد ہوئے تو قیام پاکستان کے بعد بھی مشرقی پاکستان کے حالات پر توجہ نہیں کی گئی۔ ۱۹۷۱ء میں انہیں اس سرزمین نے اپنانے سے انکار کر دیا جس کے لیے وہ بے گھر ہوئے تھے۔ خاص کر مشرقی پاکستان کے دیہاتوں میں سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ان دیہاتوں میں لوگ غربت کی وجہ سے بمشکل روزی روٹی کما سکتے تھے۔ اس کھٹن وقت میں "انور" جیسے کئی کرداروں نے دیہات میں رہ کر اور ان دیہاتیوں کی مدد کر کے ناقابل فراموش مثال قائم کر دی:

> "انور صاحب جب گھڑوں نصیحتیں انڈیلتے رہے۔ کبھی کبھار انٹرویل بھی کر لیتے۔ ان کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ وہ اتنا پڑھنے لکھنے کے بعد دیہات جا کر رہے گا۔ جہاں زندگی بہت کھٹن تھی۔ وہاں کے دیہاتوں اور مغربی پاکستان کے دیہاتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔"(۵۲)

دیہاتوں کے لوگ شہری زندگی کے مقابلے میں مدد کے زیادہ محتاج ہوتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے

دیہات مغربی پاکستان کے دیہاتوں سے بہت پیچھے تھے۔نشاط فاطمہ "انور" کے کردار کے ذریعے ہی مشرقی پاکستان کے دیہاتیوں کی کھٹن زندگی کی تصویر پیش کرتی ہیں۔

افسانہ "آج کے غم کے نام" میں نشاط فاطمہ نے ایک اور مرد کردار "نوشاد حسین" کی زندگی کی عکاسی کی ہے جو بنگال کے اندر پیدا ہوا اور اسی سرزمین سے پڑھ لکھ کر انجینئر بنا۔سقوط ڈھاکہ سے قبل جب ملک کے حالات گھمبیر ہوگئے اور لوگ مشکل صورتحال سے دوچار ہونے لگے۔تو ایسے کھٹن مرحلے پر "نوشاد حسین" نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کی مدد کرنے کی بجائے کراچی کی طرف ہجرت کی۔اور اس دوران وہ اپنے ماں باپ کو بھی ساتھ لے گیا:

"نوشاد حسین انجینئر تھا۔اسے کراچی میں کسی باہر کی کمپنی میں بڑی اچھی نوکری مل گئی تھی۔اسی کے ساتھ ماں ابا بھی جانے کو کھڑے ہوگئے۔"(۵۳)

افسانہ "آج کے غم کے نام" میں "نوشاد حسین" کے کردار نے اس مٹی سے فائدہ اٹھایا ہے اور اسی مٹی سے پروان چڑھا۔جب اس مٹی کے لوگوں پر مشکل وقت آیا تو اس مشکل میں لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونے کی بجائے اور ملک دشمن عناصر کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی بجائے ایسے میں انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ملک سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔مختلف حالات وواقعات کا سامنا کرنے کی بجائے بزدلی دکھاتے ہوئے وہ دوسرے ملکوں اور شہروں کی طرف ہجرت کرگئے۔ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ملک کی معیشت کا پہیہ رک گیا۔افرادی قوت کا زیادہ تر حصّہ دوسرے ملکوں اور شہروں کی طرف چلا گیا اور ملک کو بے یارومددگار اور نااہل لوگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ گئے۔اس افسانہ میں "نوشاد حسین" کے کردار کے ذریعے ایسے منافق لوگوں کی نشاندی کی گئی ہے جو ملک سے محبت کا دم بھرتے تھے لیکن ملک سے عہد وفانہ کرسکے۔اس میں ایسے لوگوں کو علامتی انداز میں تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے کہ اگر اس طرح کے پڑھے لکھے لوگ متحد ہوکر مشکلات کا مقابلہ کرتے اور نااہل لوگوں کے رحم وکرم پر ملک کو نہ چھوڑتے تو آج ملک نہ ٹوٹتا اور ملک کی پوزیشن اور ہوتی۔

افسانہ "دل گرفتہ لوگ" میں "شمس الحسن" کے مرد کردار کے ذریعے ایسے لوگوں کے حالات واقعات کو سامنے لایا گیا ہے جنہیں قیام پاکستان کے بعد ہجرت در ہجرت کے کرب سے گزرنا پڑا۔"شمس الحسن" اپنے

اور اپنے خاندان کے ساتھ ۱۹۴۷ء سے قبل ہی مشرقی پنجاب میں مقیم تھا۔ یہاں ان کا عالی شان گھر تھا اور اپنا کاروبار تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے نتیجے میں حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے تو وہ کچھ عرصہ کے لیے لندن گئے اور پھر واپس بنگال کی سرزمین پر بسنے لگے۔ سقوط ڈھاکہ کے دوران بنگال کے اندر بہت زیادہ فسادات اور خونریزی ہوئی۔ اس پر تشدد فضا میں ان کے اپنے بھی ان کی آنکھوں کے سامنے دار فانی کو چھوڑ گئے۔ اس کے اثرات "شمس الحسن" کے ساتھ ساتھ ان کے بچوں پر بھی پڑے۔ وہ ذہنی اور نفسیاتی مسائل کا اس قدر شکار ہوئے کہ ان کی زندگی خراب ہو گئی وہ آنے والی دنوں میں ہر وقت مایوس اور پریشان دکھائی دینے لگے:

> "شمس الحسن نام تھا۔ ریٹائر ہو چکے تھے۔ بیٹا کسی فرم میں انجنیئر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ دوسرا بیٹا بھی کافی پڑھا لکھا تھا۔ مگر آنے سے پہلے اس کی آنکھوں کے سامنے دو عزیز دوست قتل ہوئے۔۔۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔۔۔ ابھی انہوں نے لڑکی کا نکاح ہی کیا تھا کہ اس کا شوہر دفتر کے پاس بم پھٹنے سے ختم ہو گیا تھا۔۔۔ یہ واقعات دیکھ کر بڑا بھی ذہنی انتشار میں مبتلا تھا۔۔۔ اس میں شک نہیں سندھ یا کراچی کا ان میں سے کوئی ذکر بھی سننا پسند نہ کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے حزن و ملال انہیں ورثے میں ملا ہے۔"(۵۴)

"شمس الحسن" کے کردار کے ذریعے ایک ایسے کردار کی عکاسی کی گئی ہے جو اپنی زمین میں محنت کر کے اس کے پھل سے محروم ہو جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے خراب حالات کی وجہ سے ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے اپنے ہی کٹ مر گئے۔ ان حالات میں انھوں نے بنگال کی غربت اور بے چینی بھی دیکھی۔ اس ساری صورتحال کی وجہ سے وہ زندگی سے اکتاہٹ کا شکار ہو گئے۔ ان کے بچے بھی ذہنی بیماری کا شکار ہو گئے اور ہر وقت مایوس اور دکھ کی کیفیت میں نظر آنے لگے۔

سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں "شمس الحسن" کے کردار یہ صورتحال سامنے آتی ہے کہ ایک محب وطن شخص اپنے خاندان کا سکون چاہتا تھا۔ وہ بنگال کے لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہمدرد طبیعت کا مالک تھا۔ اسے بنگالیوں کی غربت اور بے کسی ہمیشہ بے چین رکھتی تھی۔ لیکن مشرقی پاکستان میں حالات اس قدر خراب ہو رہے تھے کہ وہ چاہا کر بھی ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہی بے بسی اس کو مایوسی میں مبتلا کر رہی

تھی جو اسے ہر وقت بے چین رکھتی تھی۔ مکتی باہنی کے غنڈوں نے بنگال کے اندر حالات کو بہت زیادہ ناساز گار بنا دیا تھا۔ جب "شمس الحسن" نے اپنی ہی سرزمین اور اپنے ہی لوگوں کے نصیب جگانے کے لیے بنگال کی سرزمین پر کاروبار شروع کیا تو اس کا کاروبار بہت زیادہ پھیلا۔ اس کے کاروبار کی بدولت مقامی لوگوں کو بھی روزگار کے حوالے سے بہت زیادہ فائدہ حاصل ہوا۔ ان کے حالات بھی پہلے سے بہتر ہونا شروع ہو گئے۔ "شمس الحسن" کا کاروبار بنگال کے اندر اس قدر پھیلا کہ وہ اور اس کے اہل خانہ بہت عیش و آرام کی زندگی گزارنے لگے۔ "شمس الحسن" کو اپنا خواب پورا ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ کیونکہ اس کی ہمیشہ خواہش تھی کہ وہ اپنی ہی سرزمین پر اپنوں کے لیے سرمایہ کاری کرے۔ اس حوالے حمزہ علوی رقمطراز ہیں:

> " کچھ کاروباری افراد ہجرت کے وقت ہندوستان سے براہ راست مشرقی بنگال منتقل ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ انہیں بطور، مغربی پاکستانی، شناخت کیا گیا اور پچاس کی دہائی میں بنگالی زبان کے لیے چلائی جانے والی تحریک میں ان حدف بنایا گیا اس لیے انہوں نے دلبرادشتہ ہو کر اپنا سرمایہ مغربی پاکستان منتقل کرنا شروع کر دیا۔ لیکن بڑے سرمایہ دار اس صورتحال کے باوجود مشرقی بنگال کے استحصال کرنے اور وہاں نجی سرمایہ کاری کرنے سے باز نہ رہے۔ لیکن نجی سرمایہ کاری کا بنیادی محور مغربی پاکستان تک ہی محدود رہا۔ مشرقی بنگال میں نجی سرمایہ کاری کا عمل ایک بڑا مسئلہ ہی بنا رہا"(۵۵)

مکتی باہنی کے کارکنوں نے جہاں پورے ملک کے اندر فسادات برپا کیے وہاں "شمس الحسن" کے کاروبار کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ نہ صرف کاروبار بلکہ اس کے بہت سارے رشتہ داروں کو ان کے سامنے قتل کر دیا گیا۔ بے دردی سے "شمس الحسن" اور ان کے اہل خانہ کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور کاروبار بند کرنے کے لیے ان پر دباؤ ڈالا گیا۔ جس کے نتیجے میں "شمس الحسن" اپنا کاروبار سمیٹ کر کراچی چلا گیا تاکہ اس سرزمین پر کاروباری سرگرمیاں جاری رکھ سکے۔ مگر اہل کراچی نے بھی اس کے اور اس کے خاندان والوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔ ہجرت در ہجرت کا کرب، کاروباری سرگرمیوں کے لیے موثر ماحول کا نہ ہونا، فسادات اور خون ریزی کے ماحول میں اس کے اپنوں کا اس کی آنکھوں کے سامنے شہید ہونا، ملک کی محبت کا دم بھرنے والوں کا اپنے ہی ملک کو لوٹنا وغیرہ یہ ایسے دردناک واقعات تھے کہ جس نے "شمس الحسن" اور اس کے خاندان والوں کو داخلی حوالے

سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ چاہا کر بھی ان حالات واقعات کو نہیں بھول سکتا جس کے وہ خود چشم دیدہ گواہ تھا:

"شمس نے بزنس شروع کیا۔ خدا نے اتنی برکت دی کہ وہاں ہم بہت آرام بلکہ عیش سے رہ رہے تھے۔ پھر جب وہاں مکتی باہنی نے ناطقہ بند کیا تو ہم سندھ آ گئے۔"(۵۶)

"شمس الحسن" اور اس جیسے کئی کردار محب الوطن تھے۔ جو اپنے وطن کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ جن کو وطن کی مٹی سے محبت تھی۔ وہ ملک میں سرمایہ کاری کر کے لوگوں کی معاشی مشکلات کم کرنا چاہتے تھے۔ بنگالیوں کی غربت اور بے کسی ان کو ہر لمحہ بے چین رکھتی تھی۔ وہ چاہتے تو باہر کی دنیا کی رنگینیوں اور دلچسپیوں کے مقابلے میں اپنی زمین کی چار دیواری سے جڑے رہتے "شمس الحسن" اور اس جیسے کئی کردار اس مٹی کے بیٹے تھے۔ وہ جیتے جی اپنے گھر اور کاروبار کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے اندر مکتی باہنی کے کارکنوں نے حالات اس قدر کشیدہ کر دیے تھے کہ وہ مایوس ہو گئے۔ ان حالات میں انھوں نے لوگوں کو مرتا ہوا دیکھا۔ خون کی ندیاں ان کی آنکھوں کے سامنے بہتی رہیں مگر وہ کچھ نہیں کر سکے۔ آخر کار "شمس الحسن" نے اپنے کاروبار کو یہاں سے منتقل کرنے میں ہی عافیت جانی۔ نشاط فاطمہ نے اپنے اس افسانے "دل گرفتہ لوگ" میں "شمس الحسن" کے کردار کے ذریعے ایسے سرمایہ کاروں کی نشاندی کی کہ جن کی سرمایہ کاری کی بدولت ملک کے بہت سارے لوگوں کے گھروں کا چولہا جلتا تھا۔ ان کی روزی اس سرمایہ کاری سے بلواسطہ اور بلاواسطہ جڑی ہوئی تھی۔ مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے جہاں "شمس الحسن" اور اس جیسے کئی محب الوطن خاندان ذہنی کرب کا شکار ہوئے۔ وہیں ان کی سرمایہ کاری کا ختم ہونا مشرقی پاکستان کے لوگوں کی معاشی حالت کو ابتر کر گیا۔

نشاط فاطمہ نے "محمود" کے کردار کے ذریعے کراچی کے حالات و فسادات سے تنگ آ کر امریکہ چلے جانے والے ایک ایسے شخص کی داستان پیش کی ہے جو کراچی کے اندر پلہ بڑھا اور کراچی کے اندر ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ کراچی کے اندر ہی رہ کر ملک کی خدمت کرے۔ لیکن کراچی کی صورتحال تو بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ دہشت گردی اور بدامنی نے کراچی کی فضا کو ناسازگار بنا دیا تھا۔ کراچی میں تخریبی عناصر آزادانہ گھوم رہے تھے۔ ایسے میں کراچی کے اندر رہ کر کام کرنا پرامن لوگوں کے لیے بہت مشکل

تھا۔ "محمود" جب پڑھ لکھ کر فارغ ہوا تو اس نے کراچی سے امریکہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے سب گھر والوں نے سمجھایا کہ وہ اپنے ملک سے نہ جائے۔ ان کے سمجھانے کے باوجود "محمود" کو نظر آرہا تھا کہ مجموعی طور پر پاکستان کے حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں۔ مغربی پاکستان کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کے اندر بھی لسانی اور صوبائی تعصبات کو ہوا دے کر لوگوں میں نفرت پھیلائی جارہی تھی۔ کراچی کے اندر بھی مقیم بنگالیوں کی زندگی آئے روز خراب ہو رہی تھی۔ ایسے حالات میں "محمود" کو اپنا مستقبل ڈوبتا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والے دنوں میں حالات مزید خراب ہوں گئے:

> "یہاں کے حالات تو دیکھیں۔ دیکھتے دیکھتے لوگوں کے ہاتھوں میں کلاشنکوف آگئی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں آپ سب بھی وہیں آجائیں۔"(۵۷)

شہر کراچی میں جب معمولی اور غیر معمولی واقعات کے ذریعے فضا کو ناخوشگوار بنا دیا گیا تو ایسے میں کراچی کے اندر لوگوں کو جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ نظریات، امتیازات اور تصورات کی بنا پر اختلافات کو ہوا دی گئی آپس میں ہی لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑایا گیا۔ "محمود" اس ساری صورتحال سے پریشان تھا۔ وہ ملک کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن حالات اس کے لیے ناسازگار تھے۔

افسانہ "وقت فتنہ گر" میں "قاسم علی بابو" کے کردار کے ذریعے ڈھاکہ کے حالات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ "قاسم علی بابو" اپنے اہل خانہ کے ساتھ تقسیم سے قبل بھارت کے ایک گاؤں "بارک پور" میں رہتا تھا۔ کلکتہ میں بھی ان کی اپنی کوٹھی تھی۔ تقسیم کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آئے اور بنگال کی سرزمین پر آباد ہو گئے۔ وہ اور ان کا خاندان سقوط ڈھاکہ سے جڑے حالات کے چشم دیدہ گواہ ہیں۔ "قاسم علی بابو" بڑے سکون سے کلکتہ اور بارک پور میں رہتے تھے۔ بنگال ہجرت سے قبل ان کے چچا "حفیظ الرحمن" بھارت میں ہی مقیم رہے اور وہاں زمینوں کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ جبکہ اس دوران "قاسم علی بابو" اور اس کے والد اور والدہ بنگال میں آکر مقیم ہو گئے۔ بنگال میں قیام کے دوران ان کے والد کا دل اس زمین سے نہیں لگتا تھا۔ وہ اس سرزمین میں اپنے بچھڑے دوستوں کو یاد کر کے خون کے آنسو روتے تھے۔ بنگال کی سرزمین آہستہ آہستہ لوگوں پر تنگ ہوتی گئی۔ لوگ بنگال کے حالات سے تنگ آکر ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ "قاسم علی بابو" اور اس

کے اہل خانہ کو بھی دوسرے شہروں کی طرف ہجرت پر مجبور کر دیا گیا تھی یوں نفرت کی ایسی فضا گرم ہوئی کہ بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آ گیا۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد لوگوں کو امن و سکون نظر نہ آیا۔ وہ ایک دفعہ پھر بنگال کی تقسیم میں اپنی مشکلات کا حل ڈھونڈنے لگے:

> "اب بارک پور میں میرے لیے کیا رکھا تھا۔ اس لیے وہاں جانا چھوڑ دیا تھا۔ حتی الامکان ڈھاکہ میں جی لگانے کی کوشش کرتا رہا۔۔۔ ہمیں خبر بھی نہ ہوئی اندر ہی اندر سازشیں ہو رہی تھیں۔۔۔ آزاد بنگلہ بھومی کی تیاریاں ہو رہیں تھیں۔ ہم کراچی پہنچے تو وہاں بنگلہ دیش بن گیا۔ اب یہ بنگلہ دیش کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا سوچ رہے ہیں۔"(۵۸)

بنگال کی سرزمین ہمیشہ سے لوگوں کے لیے ایک آزمائش کی جگہ رہی ہے۔ یہاں سازشی عناصر تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ لوگوں کو پاکستان مخالف سرگرمیوں میں شامل کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران بنگال مخالف تحریک چلانے والوں کو کچلنا شروع کر دیا گیا۔ نسلی، لسانی اور صوبائی تعصب کی مدد سے انھوں نے اپنے ہی لوگوں سے اپنوں کے گلے کٹوائے۔ خون ریزی کی فضا جب گرم ہو گئی تو اس دوران مکتی باہنی کے کارکن کھل کر میدان میں آ گئے۔ مشرقی پاکستان میں فسادات برپا کر دیے گئے۔ "قاسم علی بابو" اور اس کے اہل خانہ اس دوران کراچی کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ مگر کراچی میں پہنچ کر بھی ان کو ایسا لگا جیسے بنگلہ دیش کے قیام کے بعد لوگ اس بنگلہ دیش میں پھر ایک نیا ملک بنانا چاہتے تھے۔ "قاسم علی بابو" اس ساری صورتحال پر افسوس کرتے ہیں اور خون کے آنسو روتے ہیں۔ نشاط فاطمہ نے سقوط ڈھاکہ کے دوران ڈھاکہ کی زمین کے تنگ ہونے کی صورتحال کی اس طرح عکاسی کی ہے:

> "انگریز نے ہمارے خاندان کو یہاں دھکیل کے ہماری شناخت کھو دی۔۔۔ صد افسوس کہ بنگالی ہم سے بدکتے ہیں اور اودھ میں ہمیں غیر جانتے ہیں۔ ہم کہیں کے نہیں رہے۔۔۔ ڈھاکہ کا یہ گھر ان کے لیے تنگ اور بے آرام تھا۔"(۵۹)

سقوط ڈھاکہ کے دوران محب وطن اور متحدہ پاکستان کی بات کرنے والوں پر بنگال کی سرزمین تنگ کر دی گئی۔ بھارت سے بنگال کی سرزمین پر آباد ہونے والے ان لوگوں پر تشدد کیا گیا جو پاکستان سے محبت کرنے

لگے تھے۔ فسادات اور خون ریزی کا بازار گرم کر کے بنگلہ دیش کے قیام کے لیے ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کی گئی۔ اس سے بنگلہ دیش کے قیام کی راہ ہموار ہو گئیں اور سقوط ڈھاکہ کے نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے ملک دو حصّوں میں بٹ کر ہمیشہ کے لیے دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔

ب) نسوانی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ

کہانی کا وہ کردار جس کے ارد گرد سارے واقعات گھومتے ہیں اسے کہانی کے اندر مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور ہر معاملے میں فعال کردر ادا کرتا ہے۔ مقصد سے لگاؤ، تضاد، معاشرتی اور سماجی صورتحال کی آگاہی کی وجہ سے وہ ہمہ گیر شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ مرکزی کردار اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ہر کردار اپنے عہد، سماج، ماحول، قبیلے اور قوم کا حقیقی نمائندہ ہوتا ہے۔ انفرادی حیثیت اور الگ پہچان کا حامل مرکزی کردار ہی کہانی کو انجام تک لے جاتا ہے۔

سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں کچھ خواتین کرداروں کے ذریعے نشاط فاطمہ نے اپنے افسانوں کا تانہ بانہ بُنا ہے۔ نشاط فاطمہ ان کرداروں حرکات و سکنات اور اقوال و اعمال کے ذریعے قاری کے دل میں نسوانی کرداروں کے ذریعے سقوط ڈھاکہ کے دوران مغربی اور مشرقی پاکستان کے حالات وواقعات، شہروں کی صورتحال شہروں کی منظر کشی، لوگوں کی بے چینی، ڈر، خوف اور دکھوں کی تصویر کشی قارئین کے سامنے لاتی ہیں۔ وہ ان کرداروں کے ذریعے بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار کی صورتحال بیان کرتی ہیں جس سے خوف و ہراس کے معیار بدل گئے۔ وہ اپنے افسانوں میں ایسے کردار پیش کرتی ہے۔ جو جدید معاشرے کی تیزی اور رنگارنگی میں بھی مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لوگوں کی داخلی اور خارجی کیفیات کو بیان کرتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کی عکاسی نسوانی کرداروں کی صورت میں افسانے "گم کردہ رہِ منزل"، "انسان کی تلاش"، "مزدور"، "ایک پتہ"، "آج کے غم کے نام"، "دل گرفتہ لوگ"، " وقت فتنہ گر"، "وہ ڈھوندتی رہی "، وقت کی صلیب"، " وہ چلی پیا کے دیس " اور "حرف امر ہو گئے" میں کی گئی ہیں۔

"مسز ایملی براؤن" سقوط ڈھاکہ کے دوران ایک افسانوی کردار ہے۔ جن کے عمل سے سقوط ڈھاکہ

کے دوران کراچی اور چٹاگانگ کے حالات و واقعات کی عکاسی ہوتی ہے۔ بالخصوص کراچی کے اندر کے حالات خوف ،ڈر، لوگوں کا نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہونا، توہم پرستی کا عروج، اقلیتوں سے نفرت، لوگوں کے باغیانہ خیالات الغرض ہجرت اور فسادات کا شکار ہونے والے خاندان کی دکھ بھری داستان کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ "ایملی براؤن" ایک خداترس خاتون ہیں جو عملی طور پر انسانیت کے جذبے کے تحت لوگوں کے دکھ درد کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ علاقے کے مرد اور خواتین ان کو عیسائی ہونے کی وجہ سے حقارت سے دیکھتے اور ان کی مدد کو قبول کرنے کے باوجود انھیں عیسائیت کی تعلیم کا پرچار کرنے والا کہتے ہیں۔ وہ اس عورت سے اس قدر نفرت کرتے ہیں کہ اگر وہ ان کو راستہ میں مل جائے تو وہ اس دن کو منحوس سمجھتے ہیں اور راستہ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں مگر "ایملی براؤن" کا جذبہ سچا ہے اور اسے لوگوں کے دکھ درد کا احساس ہے۔ وہ لوگوں کی مشکلات کا مداوا کرنا چاہتی ہے:

> "اگر املی میم کا کوئی صبح صبح چہرہ دیکھ لے تو اس دن ضرور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا ہے۔ انھیں آتا دیکھ کر وہ راستہ بدل لیتے تھے۔ گویا وہ عورت نہیں بلی تھیں۔"(۶۰)

سقوط ڈھاکہ کے دوران جہاں دیگر شہروں کے حالات خراب تھے وہاں کراچی کے اندر بھی مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ اندھیروں نے کراچی اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں کو گھیر رکھا تھا۔ تیل اور بجلی کی پیداوار کا شدید بحران تھا۔ لوگ معاشی حوالے سے کسمپرسی اور پسماندگی کی زندگی گزار رہے تھے۔ "املی" نے رات کے اندھیروں میں لوگوں کی باتوں اور نفرتوں کی پروا کیے بغیر موم بتیاں تقسیم کرنا شروع کر دیں تاکہ لوگ اندھیروں میں ایک دوسروں سے نہ ٹکرائیں اور ان کی مشکلات کم ہوں۔ ایسے میں بارش کے دنوں میں بھی وہ سچی محبت اور لگن سے اپنا کام جاری رکھتیں:

> "املی براؤن اس بادباراں میں موم بتیاں بانٹتی پھر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے گھسے ہوئے کوٹ کی جیب سے موم بتیاں نکال کر دیں اور تیز ہوا کے نم سرد جھونکوں میں تھرتھراتی جانے کو مڑیں۔۔۔ وہ ایسی چھوٹی چھوٹی خدمات اکثر محلے والوں کی کیا کرتی تھیں۔ وہ بات دوسری تھی کہ محلے والے ان کی نیت کو صاف نہ سمجھتے تھے۔"(۶۱)

املی براؤن ایک خدا ترس انسان تھیں۔ لوگوں نے کبھی بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا مگر اس کے باوجود بھی وہ انسانیت سے اور ملک سے محبت کرتیں تھیں۔ ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

"ہم سب کو پچھلے دروازے سے اس کے مسز ایملی براؤن میم کے گھر اس وقت پناہ لینا پڑی۔ جب تک ہم کراچی کے لیے روانہ ہوگئے۔ ہم سب گول میز کے گرد بیٹھے تھے۔ وہ ہمیں اپنی نجس پیالیوں میں چائے پلاتی تھی۔"(۶۲)

افسانہ "انسان کی تلاش میں "صنوبر" کے کردار کے ذریعے ایک ایسا نقشہ کھنچا گیا ہے جس میں صنوبر ایک نسوانی کردار ہے۔ اس کو ہجرت سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر جب ۱۹۷۱ء کا واقعہ رونما ہوا تو اس کو ایک بار پھر ہجرت کرنا پڑی۔ اس کی عکاسی نشاط فاطمہ نے یوں کی ہے:

"صنوبر کے والدین پانچ برس کی صنوبر اور آٹھ دس برس کے بھائی کو لے کر بمبئ سے یہاں آکر چٹاگانگ میں مقیم ہوگئے۔۔۔ وہ ایک مہینہ یہاں ٹھہرنا چاہتے تھے اول اس کو گھر کا سامان بیچنا تھا اور دوم اور ضروری کام تھے۔ بنگال سے وہ برباد ہو کر آئے تھے"(۶۳)

ان کے خاندان والے سقوط ڈھاکہ سے اس قدر دوچار ہوئے کہ ان کے لیے خوشی اور ناخوشی کی اب کوئی اہمیت نہ تھی۔ دکھ برداشت کر کے وہ زندگی سے تنگ آگئے۔

"وہ کچھ دیر خاموش اپنی پھر کہنے لگی۔ کہ ہم انسان کی تلاش میں نکلے ہیں۔ شاید وہاں انسان مل جائے اور بابا کا وطن ہے شاید وہاں خوش ہوں۔"(۶۴)

قیام پاکستان سے قبل مشرقی بنگال کے رہنے والے لوگ معاشی حوالے سے ابتر تھے۔ مشرقی بنگال کے مقابلے میں مغربی بنگال کے اندر لوگوں کا معیار زندگی قدرے بہتر تھا۔ مغربی بنگال کے اندر زیادہ تر کارخانے تھے۔ مشرقی بنگال کا علاقہ تقسیم کے بعد پاکستان کے حصّے میں آیا۔ لیکن بدقسمتی سے تقسیم پاکستان کے بعد بھی ملک پاکستان کے حکمران مشرقی پاکستان کے لوگوں کے معاشی حالات سے آگاہ نہ ہوئے۔ مشرقی پاکستان کے اندر مغربی پاکستان کے تاجروں نے سرمایہ کاری کی مگر اس کے باوجود بھی دونوں صوبوں کے درمیان وسائل کی تقسیم کے شکوے رہے۔

افسانہ "انسان کی تلاش" میں "واحد متکلم" کے کردار کی بیوی کے ذریعے نشاط فاطمہ نے ان لوگوں کی صورتحال کی عکاسی کی ہے جو سانحہ مشرقی پاکستان بنگال کے رہائشی تھے۔ اس دوران ہجرت کر کے مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کے شہر کراچی آ گئے۔ اگرچہ یہاں پر ان کی زندگی پہلے سے بہتر تھی لیکن اس کے باوجود بھی "واحد متکلم" کے کردار کی بیوی کو یہ امید ہے کہ وہ واپس مشرقی پاکستان چلے جائیں گئے۔ کیونکہ اس وطن سے ان کی گہری یادیں وابستہ ہے:

> "میں یہاں آ کر مصیبتیں اٹھا اٹھا کر بھول گئی ہوں۔ اور خدا جانے کیوں دل میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا تھا کہ واپس جانا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا اور ہم چلے جائیں گئے۔"(۶۵)

افسانہ "انسان کی تلاش" میں "صنوبر" کا کردار سقوط ڈھاکہ کے دوران آنے والے فسادات کا چشم دیدہ گواہ ہے۔ بنگال کی سرزمین اس پر اور اس کے خاندان پر تنگ کر دی گئی۔ "صنوبر" ایک ایرانی نسل کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی جس کا شوہر فسادات میں مارا گیا۔ حالانکہ اس خاندان نے وطن کی محبت کی خاطر ۱۹۴۷ میں بمبئی سے چٹاگانگ کی طرف ہجرت کی تھی۔ "صنوبر" کے والدین نے جب ہجرت کی تو اس وقت "صنوبر" کی عمر پانچ برس تھی۔ فسادات کے دنوں میں "صنوبر" کا باپ ایران کی طرف جانا چاہتا تھا۔ وہ ایک مہینہ صرف اس لیے رک گیا کہ گھر کا سامان بیچ سکے اور دوسرے کام نمٹا سکے۔ بنگال سے اس کا خاندان بری طرح سے برباد ہو کر آیا تھا۔

الغرض قیام پاکستان کے بعد بھی مغربی پاکستان کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کا معیار زندگی بہتر نہ ہو سکا۔ وہ مایوس ہو گئے۔ انھیں آئے روز اپنے حالات کی خرابی کا احساس ہونے لگا۔ مشرقی پاکستان میں غربت بڑھ گئی۔ لوگوں کا معیار ابتر سے ابتر ہونے لگا۔ ان کے اپنے وسائل ان پر خرچ ہونے کی بجائے مغربی پاکستان میں جب استعمال ہونے لگے تو اس سے وہ نفسیاتی مسائل کا شکار ہو گئے۔

افسانہ "بھر بھری ریت کا طوفان" میں "روزن" ایک ایسی لڑکی کا کردار ہے جس کے معاشی حالات سے اس دور کے مشرقی پاکستان کے لوگوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ "روزن" ایک غریب گھر میں پیدا ہوئی۔ اس کے گھر والے اس کو منحوس تصور کرتے ہیں۔ لیکن وہ گھر کے حالات بدلنے کے لیے کوشاں ہے۔ وہ پیسہ کما کر

گھر والوں کے حالات بہتر کرنا چاہتی ہے۔ وہ لوگوں کو باتیں کرتے سنتی ہے کہ اسے عرب لے جائے وہ سارے کام کرنا جانتی ہے تاکہ اس سے وہ اپنے ابا کی ٹانگ کا علاج کروا سکے گی۔ ماں اور بہنوں کے لیے اچھے کپڑے خرید سکے۔ گھر والے غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اندھی دادی کے ساتھ "روزن" کو بھیک مانگنے پر مجبور کرتے ہیں لوگ ان کی حالت دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں کہ کہیں سقوط ڈھاکہ کا سانحہ دوبارہ تو نہیں ہو گیا، کہیں پھر سے مشرقی پاکستان الگ تو نہیں ہو گیا، کہیں پھر سے لوگوں کی بدحالی اور بے بسی واپس تو نہیں آگئی اور کہیں غربت نے پھر سے سر تو نہیں اٹھالیا۔ وہ ان کی ظاہری حلیے کو دیکھ کر اس دور کے مشرقی پاکستان کے اندر چلے جاتے ہیں جہاں غربت اور بدحالی بہت زیادہ تھی۔ جہاں لوگ معاشی بدحالی کا شکار ہو گئے:

> "جب وہ اور اس کی دادی بس سے اتریں تو لوگوں نے چونک کر دیکھا۔ جیسے مشرقی بنگال علیحدہ ہی ہوا ہو اور ایک بار پھر قحط زدگان بنگال کی پورش شروع ہو گئی ہو۔ اکثر لوگ تو فکر مند ہوئے کہ یہ بلا پھر نازل ہو گئی۔۔"(٦٦)

افسانہ "وقت کی صلیب" میں "ڈورس میم" ایک نسوانی کردار ہے۔ "ڈورس میم" جب سات سال کی تھی تو ہجرت کر کے پاکستان میں آئی تھی۔ حالانکہ وہ ایک مذہبی خاتون تھیں مگر اسے اس مٹی سے اس قدر محبت ہو گئی کہ بچوں کے چھوڑ جانے کے باوجود بھی اس نے اس ملک کو نہیں چھوڑا۔ نشاط فاطمہ اپنے اس افسانے میں اس کردار کے ذریعے یہ واضح کرتی ہیں کہ ایک نظریے اور نصب العین کے تحت حاصل کیا جانے والا ملک اور اس کے باشندے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ایک دوسروں سے الگ ہو گئے۔ وطن کی مٹی سے محبت کا تصور بھی ان کے ذہنوں میں مانند پڑ گیا۔ نشاط فاطمہ لکھتی ہیں کہ وطن سے محبت ایسی ہوتی ہے جیسے "ڈورس میم" کی تھی جس نے غربت اور کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے کے باوجود بھی اس دیش کو نہیں چھوڑا:

> "یہ میرا شہر ہے۔ میرا واحد دوست ہے۔ میں اسے کیسے ترک کر سکتی ہوں۔ میں مر کر بھی اس سڑک پر گر جا کے سامنے کھڑی ملوں گئی۔"(٦٧)

بنگال کی زمین ایسی زمین تھی کہ اسی زمین سے آزاد ریاست کے حصول کے لیے تحریک چلانے کا اعلان ہوا تھا۔ مسلمانوں نے اپنے حقوق کے لیے ایسی ریاست جسے وہ اپنا وطن سمجھیں، جو ان کی پہچان ہو، اس کو عملی طور پر حاصل کرنے کے لیے بنگال سے ہی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ تحریک پاکستان میں لاکھوں لوگوں کی جانی مالی

قربانی کے بعد یہ ملک حاصل ہو گیا، تو اس کے بعد وہ لوگوں کی محبت کا امتحان تھا۔ ہر طرح کی آزمائش ہی اصل محبت کا امتحان ہوتی ہے اسی وطن سے سے خوشیاں بھی ملتی ہے اور غم بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ رنج، مسرتیں، محبتیں حتٰی کہ نفرت تک بھی اہل وطن کو برداشت کرنے ہوتے ہیں۔ لیکن تقسیم کے بعد لوگ آپس میں نفرتوں کا شکار ہو گئے صوبائیت پرستی، لسانی تفریق اور نسلی تعصب وغیرہ نے اپنوں سے جدا کر کے اور خون کی ہولی کھیل کر ایک دوسرے کی زندگیاں تنگ کر دیں۔ نشاط فاطمہ غیر ملکی اینگلو انڈین خاتون کے کردار کے ذریعے وطن سے محبت اور ثابت قدمی کے عملی مظاہرے کو پیش کرتی ہیں۔ "ڈورس میم" نے غیر ملکی ہونے کے باوجود بھی موت آنے تک اس مٹی سے وفا کی اور اپنوں نے سقوط ڈھاکہ جیسے حالات پیدا کر کے ہمارا دایاں بازو ہم سے ہمیشہ کے لیے الگ کر دیا:

"آپ کو ہوم جانے کی تمنا ہے؟ ہوم کس کا ہوم۔ ہاں کہہ دو یہ میرا وطن نہیں ہے۔ اتنا ہی میرا وطن ہے جتنا تمہارا ہے۔"(۶۸)

سقوط ڈھاکہ کے دوران جب حالات خراب ہو گئے تو اس کے اثرات ملک کے ساتھ "ڈورس میم" کی زندگی پر بھی پڑے۔ ان حالات میں لوگوں نے ہجرت کی۔ دوسروں کے مشوروں کے باوجود بھی ایک غیر ملکی خاتون نے پاکستان کی مٹی سے وفا کی۔ وہ اندھیروں میں دیا جلانے کی امید سے ثابت قدم رہیں:

"تم بھی کہتی ہو۔ ہوم چلی جاتیں۔ خدا نہ کرے جو ولایت میرا ہوم ہو۔ پاکستان میرا وطن ہے۔ میں کیوں ایسے لوگوں کے ملک جاؤں اور اسے ہوم کہوں جو جنگلی نسل بنا کر چھوڑ گئے۔ وہ بیسد مجنوں کے درخت کی طرح کانپنے لگیں۔"(۶۹)

"ڈورس میم" نے ولایت کے بجائے پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی مگر ہمارے ملک سے محبت کا دم بھرنے والے لوگوں نے پاکستان کو دولخت کر دیا۔ نشاط فاطمہ اپنے افسانے میں ہجرت کا حقیقی درد جو لوگوں کو سقوط ڈھاکہ کی وجہ سے مشرقی اور مغربی پاکستان میں برداشت کرنا پڑا اس کی عکاسی "ڈررس میم" کے کردار کے ذریعے کی ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے دوران ہجرت کے کرب نے کس طرح لوگوں کو جیتے جی مار دیا تھا۔ "ڈورس میم" کو اپنے شوہر کے مرنے کا غم اتنا نہیں تھا جتنا بچوں کے ہجرت کرنے سے ہوا:

"انہوں نے ترک وطن نہیں کیا۔ وہ اس خاک پر دفن ہیں جو وطن کہلاتی ہے۔ بچوں کے جانے کے بعد میں اس لیے روئی کہ وہ ہجرت کر کے چلے گئے۔۔۔ جدائی موت سے زیادہ شاق گزرتی ہے۔ جب زمین سے رشتے ٹوٹتے ہیں تو انسان کی ذات بھی ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے۔"(۷۰)

نشاط فاطمہ پاکستان سے محبت کرنے والے والے حقیقی لوگوں کے چہرے کو "ڈورس میم" کے کردار کے ذریعے سامنے لاتی ہیں۔ پاکستان سے محبت اور اس کی خاطر کٹ مرنے کا دم تو بہت سے لوگ بھرتے تھے لیکن اس آزمائش وہ ناکام رہے۔ آنے والی آزمائشوں پر پورا اترنا ہی اصل محبت ہوتی ہے:

"مگر اب اسٹور میں پڑی ہیں۔ اپنے بچوں کے پاس کیوں نہیں چلی جاتی۔ ارے کیسی کوڑے مغز ہو، کیوں چلی جاؤں، یہ میرا وطن ہے۔ یہاں میں سات سال کی آئی تھی۔ اب ستر برس کی ہوں۔ مگر تم نہیں سمجھو گئی۔"(۷۱)

نشاط فاطمہ نے علامتی انداز کے ذریعے سقوط ڈھاکہ کی ذمہ داری اپنوں پر ڈال دی ہے۔ مشکل وقت میں ملک کا دفاع کرنے کے بجائے ملک دشمن سازشی عناصر کے ساتھ ملنے والے کوئی اور نہیں تھے بلکہ یہ ہمارے اپنے ہی تھے جو وقت آنے پر ملک سے وفا نہ کر سکے۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل بھی پاکستان کے حالات کشیدہ تھے۔ ملک ابتدا ہی سے آزمائشوں کا شکار رہا۔ قرضے پر قرضے چڑھتے گئے۔ یہ عناصر سقوط ڈھاکہ کا باعث بنے لوگ مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کی باتیں کرنے لگے۔ سقوط ڈھاکہ کے دوران لوگوں کو ایک دفعہ پھر گھر بار چھوڑ کر اجنبی ہونا پڑا۔ بستیاں ویران ہوئیں۔ اجنبی زمینوں پر ضمیمہ زن ہونا پڑا۔ اس واقعے سے لوگوں کے گھر اور دل دونوں ٹوٹ گئے۔:

"تیز سے تیز بارشیں ہوئیں۔ لوگ خوب نہائے۔ بنگال ہم سے منقطع ہوا۔ قرضے کے پہاڑ کھڑے طوفان آئے۔ ہواؤں کے رخ بدلے۔ سیلاب آئے اور بہت کچھ بہالے گئے۔ بستیاں ویران ہوئیں۔۔۔ لوگوں کو گھر بار چھوڑ کر اجنبی زمینوں پر خیمہ زن ہونا پڑا۔ دل ٹوٹے، گھر اجڑے۔"(۷۲)

سقوط ڈھاکہ سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ دونوں طرف سے لوگ ایک دوسرے پر جان دینے کی باتیں کرتے تھے ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ الگ ہو

گئے۔ وہ وطن کی محبت میں ناکام رہے۔ جب ملک کی سالمیت کی بات آئی۔ تو سقوط ڈھاکہ تک کا سانحہ برداشت کر گئے۔ اپنے ہی ملک کو اپنے ہی ہاتھوں سے لوٹ لیا۔ اپنے ملک کے خود ہی دشمن بن گئے۔ اصل محبت تو "ڈورس میم" کی ہے۔ ایک غیر ملکی اینگلو انڈین خاتون نے پاکستان سے جھوٹی محبت کرنے والوں کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ وطن سے محبت کس طرح کی جاتی ہے۔ اس نے پاکستان سے محبت کر کے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے اور پیغام دیا ہے کہ پاکستان سے محبت اس طرح کی جاتی ہے۔

افسانہ "مزدور" میں "شفن" کے نسائی کرداروں کے ذریعے ایسے لوگوں کے کرداروں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو تقسیم ہندوستان سے قبل پاکستان کے قیام کے خلاف تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد یہ لوگ پاکستان آ گئے۔ پاکستان میں عیش و آرام کی زندگی گزارنے لگے۔ حالانکہ ان لوگوں نے قیام پاکستان سے قبل مسلم لیگ کا ساتھ دیا نہ جانی مالی قربانی دی بلکہ "اکن" ماموں جیسے محب وطن لوگوں کو تحریک پاکستان سے دور کرنے کی کوشش کی۔ ان کا ایسی سرگرمیوں میں شمولیت پر مذاق اڑایا۔ نشاط فاطمہ نے علامتی انداز کے اندر "شفن" کے کردار کا موازنہ قیام پاکستان کے بعد ان لوگوں کے روائیوں سے کیا ہے جو ملک کے وسائل پر مکمل طور پر فائض ہو چکے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو قیام پاکستان سے قبل پاکستان کے قیام کے خلاف تھے مگر پاکستان بننے کے بعد ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دی۔ ایسے لوگوں کی بدولت سقوط ڈھاکہ جیسا واقعہ پیش آیا۔ یہ لوگ دشمن قوتوں کے ساتھ مل گئے اور پاکستان میں عیاش پرستی کی زندگی گزارنے لگے:

> "شفن یہاں کراچی میں ایک نئی وجود آئی ہوئی۔ سوسائٹی میں رہ رہی تھیں۔ ان کی کوٹھی میں دنیا جہاں کا سامان بھرا ہوا تھا۔ جسے دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ ایسی کوئی بھی چیز ان کے پاس ہندوستان میں نہ تھی۔ ایک شفن کے ٹھاٹ باٹ اور کروفر تھے۔"(۷۳)

کئی لوگوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ان میں سے اکثر ملک وسائل پر قابض تھے۔ یہ وہی لوگ تھے۔ جنہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی اور محب وطن نہیں تھے۔ نشاط فاطمہ نے شفن کے نسوانی کردار کے ذریعے ایسے لوگوں کے کرداروں سے پردہ اٹھایا ہے جو دل سے پاکستان سے محبت نہیں کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ملک کے وسائل چند ہاتھوں تک محدود ہو گئے۔ اقتدار کی ہوس نے

ہمارے حکمرانوں کو لالچ میں مبتلا کر دیا۔ ان کے خون سے اپنوں کے لیے کشش ختم ہو گئی۔ وہ ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے لگے۔ جب سقوط ڈھاکہ کے دوران کشیدہ حالات پیدا ہونے لگے تو ان میں بہت سارے لوگوں نے ملک کو متحد کرنے کے بجائے ملک کو توڑنے کی بات کی۔ فسادات، ہجرت میں مسلمانوں کے مسائل سے ایسے لوگوں کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ ملک دشمن عناصر نے جب سازشوں کا جال بچھا دیا تو ان میں سے بہت سارے لوگ اپنوں کے دکھوں کا مداوا کرنے سے دستبردار ہو گئے۔ کئی لوگوں نے مشرقی پاکستان کی تحریک کو مضبوط کرنے کے لسانی اور صوبائی پر تعصب کو ہوا دی۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے بھارت اور دیگر عالمی عناصر کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کے لیے کام کیا۔

افسانہ "مزدور" کے اندر "شفن" جیسے کردار کے ذریعے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی علیحدگی میں ایسے کردار بھی موجود ہیں جو قیام پاکستان سے قبل پاکستان کے قیام کے مخالف تھے۔ ان لوگوں نے دیگر افراد کو بھی مسلم لیگ میں شامل ہونے سے روکا۔ ایسے لوگوں کا مذاق اڑایا جو مسلمانوں کے علیحدہ وطن کی بات کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہی لوگ ملک سے فائدہ اٹھانے میں سر فہرست نظر آتے ہیں۔ اب یہ امن و امان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی کوٹھیاں دنیا جہاں کے سامان سے بھری ہوئی ہیں جنھیں دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ حالانکہ ایسی چیزیں انھیں ہندوستان میں میسر نہیں تھیں۔ وہ ہندوستان میں رہنے والے ان لوگوں کو بھی بھول گئے تھے جو ان کے قریبی عزیز و اقارب تھے۔ ایسے لوگ تو صرف خود غرض اور متکبر ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو ملک کی ترقی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کے سامنے جب سقوط ڈھاکہ کا واقعہ رونما ہوا تو انھوں نے ملک کو بچانے کے لیے عملی طور پر کوئی ایسا کام نہیں کیا۔

نشاط فاطمہ کے افسانہ "مزدور" میں "شفن" کا کردار اہم ہے جو قیام پاکستان سے پہلے پاکستان سے نفرت کرتی تھی۔ مسلم لیگ میں چندہ جمع کروانے والوں کو روکتی تھی اس کے نزدیک قیام پاکستان ایک فضول چیز ہے۔ ان کو یقین تھا کہ ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا جب پاکستان معرض وجود میں آئے گا۔ نشاط فاطمہ نے سقوط ڈھاکہ کے ذمہ دار بھی ایسے ہی لوگوں کو ٹھہرایا ہے جو محب وطن نہیں تھے۔ مشکل وقت میں بھی انھوں نے ملک کا ساتھ نہیں دیا:

"یہاں کیسے کیسے لوگ آئے ۔ وہ لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان بنے اور ان لوگوں نے خوب فائدے اٹھائے لیکن جیسے ان کو کسی چیز کی حاجت نہ تھی۔"(۷۴)

جب پاکستان دنیا کے نقشے پر آیا تب ایسے لوگ بھی پاکستان میں ہجرت کر کے آئے جو محب وطن تو نہ تھے مگر ان کو ذاتی مفاد عزیز تھا۔ ایسے عناصر نے پاکستان کی نازک صورتحال سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ ملک کے وسائل کے بڑے حصّے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان لوگوں نے ہر موقع پر بھرپور فائدئے اٹھائے۔ لیکن جب بھی ملک پر برا وقت آیا ان لوگوں نے ملک اور اس کے باشندوں کے بارے میں نہیں سوچا۔ "شفن" کے کردار کے ذریعے نشاط فاطمہ ایسے چہروں سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ ملک سے ایک طرف سے حقیقی محبت کرنے والے لوگ تو پاکستان میں نہ آسکے لیکن دوسری طرف منافقت کے چہرے میں چھپے ہوئے لوگ پاکستان میں آ کر تباہی و بربادی کرنے لگے ۔ ان لوگوں کی وجہ سے سقوط ڈھاکہ کا واقعہ پیش آیا۔ لوگوں کی مشکلات اور پریشانیاں بھی ان ہی لوگوں کی مرہون منت ہیں۔

"شفن" کا کردار جیسے لوگ کبھی وطن سے محبت نہیں کر سکتے۔ مشکل پڑھنے پر ایسے لوگ وطن کا ساتھ نہیں دیتے مگر اس کے مقابلے میں بہت سے لوگ ایسے تھے جنھوں نے صحیح خلوص دل سے پاکستان سے محبت کی ان کی ملک کے لیے نیک خواہشات قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہیں:

"مگر میرے ذہن میں بات واضح نہیں ہوئی کہ ان کو غازی کہوں یا شہید۔ نہ وہ کوئی جنگ لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔۔۔تب مجھے اکن ماموں کی کہی ہوئی بات یاد آئی۔ یعنی وہ سید اکمل حسین اپنے متعلق صحیح کہتے تھے۔"(۷۵)

سقوط ڈھاکہ کی بدولت ملک کو مشرقی اور مغربی پاکستان میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایسے میں "شفن" جیسے کرداروں نے محض ذاتی فائدہ اٹھایا۔ ملک کو متحد کرنے میں کامیاب نہ ہونے کے باوجود ایسے حالات میں اس طرح کے لوگوں کو خراج تحسین پیش کیا گیا جنھوں نے جنگ لڑی اور نہ شہید ہوئے۔ نہ ان کو غازی کہا جانا چاہیئے اور نہ وہ شہدا میں شامل ہو سکتے ہیں۔ درحقیقت ایسے حالات میں لوگ جو دل و جان سے پاکستان سے محبت کرتے ہیں وہ وہی لوگ حقیقی پاکستان اور مسلمانوں کے خیر خواہاں ہیں۔

سقوط مشرقی پاکستان کے دوران جہاں جنگی قیدیوں کو قید و بند کی تکلیفیں برداشت کرنی پڑی وہیں ان کی گھریلو زندگی بھی بری طرح متاثر ہوئی۔ نشاط فاطمہ نے "دارا" کے کردار کے ذریعے سانحہ مشرقی پاکستان کے دوران اپنوں سے دشمنی اور نفرت کی تصویر کشی کی ہے "شانہ آپا" دارا کی بہن ہیں۔ جب "دارا" مشرقی بنگال کے محاذ پر فرائض سرانجام دینے کے بعد واپس گھر آتا ہے تو وہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ اس کے اپنے ہی گھر والے اس کے دشمن بنے بیٹھے ہیں۔ یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس میں اپنوں کے چہرے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ حیران تھا کہ اپنے اور پرائے کی تمیز ختم ہو گئی ہے۔ اس کی اپنی بہن نے اس کے گھر پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس سازش میں اس کے بھائی اور "زبیدہ آپا" بھی شامل تھیں۔ گھر کے سلسلے میں ان تینوں کے درمیان تنازعہ چل رہا تھا۔ وہاں "شانہ آپا" دارا سے دستخط کروا کے "دارا" کی ساری زمین پر قبضہ کرنا چاہتی تھیں نفرت اور لالچ کو دیکھ کر دارا "حیران رہ گیا۔ سقوط ڈھاکہ کے دوران نشاط فاطمہ نے اپنے ہاتھوں سے اپنوں کو لوٹنے کی تصویر کشی کی ہے:

> "گھر میں بڑی بہن شانہ آپا رہ رہی تھیں۔ وہ ماحول میرے لیے اجنبی تھا۔ شانہ آپا، بھائی جان اور زبیدہ آپا میں گھر پر تنازعہ چل رہا تھا۔۔۔ میں نے ان سے کہا آپ جہاں کہو گئے میں وہاں دستخط کرتا چلا جاؤں گا۔ انہیں اس وقت تک اطمینان نہ ہوا۔ جب تک میں نے دستبرادی کے دستخط نہ کر دیئے۔"(۷۶)

نشاط فاطمہ نے اپنے افسانے "ایک پتہ" میں شانہ آپا" کے نسوانی کردار کے ذریعے ایک دردناک کہانی کا منظر پیش کیا ہے کہ کس طرح سانحہ مشرقی پاکستان کے دروان اپنے اپنوں کے دشمن بن گئے۔ بزرگوں کا لحاظ، اپنوں سے محبت کا احساس اور ان کی عزت، ان کا کہنا ماننا، ان کا خیال رکھنا ہماری ثقافت اور گھریلو تربیت کا حصّہ ہے مگر سقوط ڈھاکہ کے دوران یہ ایک خواب سا لگنے لگا کہ کس طرح سے ہمارے اپنوں نے ہمیں لوٹا:

> "شاہنہ آپا کے جذبات ختم ہو چکے تھے اور میرے نزدیک وہ انسان نہیں جو جذبات سے عاری ہو۔ انھوں نے اپنے رشتے پتھر کے گھر اور اس کی قیمت سے استوار کر لیے تھے۔"(۷۷)

رشتے اور تعلق عزت و توجہ کی وجہ سے برقرار رہتے ہیں۔ ان رشتوں میں جس قدر تعظیم ہو اتنے ہی یہ

رشتے گہرے اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ سانحہ سقوط ڈھاکہ کے دوران نفسا نفسی جیسی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس سانحہ کے دوران لوگ اپنی زندگی کے مسائل، مصائب اور الجھنوں میں اس طرح الجھ کر رہ گئے کہ وہ اپنے ہی خونی رشتوں اور دیگر رشتوں کو پہچاننے سے انکار کرنے لگے۔ اپنے ہی گھروں سے ایک دوسرے کو نکال کر قبضہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک دوسرے کی باتوں کو برداشت کرنا چھوڑ دیا۔ رشتوں سے کنارہ کشی کرنے لگے حالانکہ انسان رشتوں کے بغیر نامکمل ہے اور یہی رشتے اسے مصیبت میں سہارا دیتے ہیں۔ رشتے تو توجہ و قربانی اور وقت مانگتے ہیں اور اسی سے مضبوط ہوتے ہیں۔ ایک تناور درخت کی طرح انسانی رشتے بھی ہری بھری ٹہنیوں کی طرح ہوتے ہیں اگر ٹہنیاں سوکھ جائیں تو پورے کا پورا درخت مرجھا جاتا ہے لیکن سقوط ڈھاکہ کے دوران "شانہ آپا" جیسے کرداروں نے اپنوں پر ہی گھر کی چار دیواری تنگ کر کے ان خونی رشتوں کو توڑ دیا۔ یہ کہانی "دارا" جیسے فوجی جوان کو چیر کر رکھ دیتی ہے۔ وہ اپنے رشتوں کو پتھر کے گھر جیسا دیکھ کر بہت دکھی ہوتا ہے۔

افسانہ "آج کے غم کے نام" میں نشاط فاطمہ نے "سکینہ" کے نسائی کردار کے ذریعے ایک ایسی عورت کی کہانی پیش کی ہے جو قیام پاکستان کے بعد اپنے خاوند کے ساتھ نئے وطن کی محبت کی خاطر کر کے بنگال کی سرزمین پر آباد ہوئی۔ لیکن سقوطِ ڈھاکہ سے قبل حالات وواقعات کی بدولت اس کے دل سے وطن کی محبت ختم کر دی گئی۔ اس پریشانی میں وہ اس قدر بیزار ہوئی کہ بنگال سے دوبارہ ہجرت کے لیے مجبور ہو گئی۔

> "یہ انھیں یہاں کس نے بلایا تھا اور نہ آلہ آباد پیٹالہ اور امرتسر بنا تھا۔ وہ سخت بیزار تھیں اور ہر دم موقع کی تلاش میں رہتیں کہ کوئی وسیلہ بنے اور یہاں سے نکل بھاگیں۔ وہ اس موقع کے انتظار میں ادھیڑ عمری کو پہنچ گئی تھیں۔ ان کے بال سفید ہو گئے اور بچے جوان ہو گئے تھے۔"(۷۸)

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کے کشیدہ حالات کشیدہ ہو گئے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد مشرقی پاکستان میں اس قدر حالات بدتر ہو گئے تھے کہ پاکستان سے محبت کرنے والے لوگوں کو پاکستان سے ہی نفرت ہونے لگی۔ افسانے کی مرکزی کردار "سکینہ" جب ادھیڑ عمر کو پہنچ گئی اور اس کے بال بھی سفید ہو گئے تھے تو وہ پھر بھی

بنگال کی صورتحال اور ماحول سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ "سکینہ "کا بیٹا "سجاد" وطن سے شدید محبت کرتا تھا۔ وہ مشکل وقت میں بھی بنگال کے لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ ماں باپ کے اسرار کے باوجود اس نے بنگال اور اس کے لوگوں کو نہ چھوڑا:

"دیکھو بیٹا سجاد یہاں رکھا ہی کیا ہے پھر ویسے بھی یہاں کے حالات کچھ اوپر تلے ہو رہے ہیں۔ انھوں نے اسے قائل کرنا چاہا۔"(۷۹)

سقوطِ ڈھاکہ کے دوران لوگوں پر زندگی تنگ ہو گئی تھی۔ اس مرحلے پر بھی وطن سے محبت کرنے والے کچھ لوگ اس امید پر تھے کہ مستقبل میں حالات بہتر ہو جائیں گئے۔ انھوں نے ثابت قدم رہنے کی کوشش کی اور مشکل وقت میں بھی وطن کی خدمت کو عبادت سمجھ کر تکالیف برداشت کیں۔

سقوطِ ڈھاکہ کے دوران جب مشرقی پاکستان کے اندر بالخصوص حالات خراب ہوئے تو ہجرت کے بعد لوگوں کو ایک مرتبہ پھر دوبارہ ہجرت میں ہی اپنی اور اہل خانہ کی بہتری نظر آئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے لوگ حالات سے مجبور ہو گئے کہ دل خون کے آنسو روتا ہے:

"سوار ہوتے وقت دونوں ماں باپ بہت اُداس اور ہر سال تھے اور اسے اکیلے چھوڑتے ہوئے وہ خود کو اُدھورا محسوس کر رہے تھے۔ انھوں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہاں کے حالات خراب ہوتے نظر آرہے ہیں۔۔۔ اماں تو اتنی خوش تھیں جیسے یہاں امنڈتی گھٹاؤں اور ہر سو بکھری ہریالی میں ان کا دم گھٹ گیا ہو اور اب وہ تازی ہوا اور روشنی میں سانس لینے جا رہی ہوں۔"(۸۰)

یوں تو مشکل وقت میں وطن کے ہر فرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ملک کا ساتھ دے۔ ملک کی مشکلات کم کرے اور ملک کی قربانیوں میں اپنا حصّہ ڈالے لیکن جب ملک کے اندر اپنے ہی ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگیں اور ایک دوسرے پر زمین تنگ کر دیں تو لوگ مجبور ہو کر ایک دفعہ پھر کسی اور پر امن جگہ کی تلاش میں ہجرت کر کے اپنوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ "سکینہ "کا کردار بھی ایسا کردار ہے جو سقوطِ ڈھاکہ کے دوران بنگال کے حالات سے تنگ آکر شدید ذہنی کرب کا شکار ہو گئی تھی۔ اس ہجرت کے دوران اسے اپنے بیٹے سے بھی جدائی کا دکھ اٹھانا پڑا جو بنگال کی سرزمین سے محبت کا دم بھرتا تھا۔ "سکینہ " کے اصرار کے باوجود وطن

کے لوگوں کے ساتھ مشکل وقت میں کھڑا ہونے کی خاطر اس کو اپنے سگے بیٹے سے جدائی برداشت کرنا پڑی۔ اس چیز نے اس کو ذہنی اور نفسیاتی مسائل سے دوچار کر کے گہرا صدمہ دیا۔

نشاط فاطمہ کے افسانے "آج کے غم کے نام" میں "سروج عرف سروجنی رائے" بھی ایک ایسی نسائی کردار ہے کہ جب مشرقی پاکستان کے حالات ابتر ہو گئے تھے تو وہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کی مشکلات کم کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے نانا نانی کے پاس مشرقی پاکستان میں ایک علاقے "کوملا" میں رہتی تھی اور وہ یہیں وہ پلی بڑھی۔ کلکتہ میں اس کا آرام دہ گھر تھا لیکن چھٹیاں ہوتے ہی وہ نانا نانی کو ملنے بنگال کے اس گاؤں میں جاتی۔ سقوطِ ڈھاکہ کے دوران جب بنگال کے حالات خراب ہوئے تو یہ لڑکی حالات خراب ہونے کے باوجود بھی اپنے نانا نانی کے گھر "کوملا" میں آتی جاتی رہتی رہی۔ یہ دوسری لڑکیوں سے قدر مختلف تھی جو مشکل وقت میں آپنوں کے ساتھ کھڑی والی اور ان کا دکھ درد بانٹنے والی تھی۔ اس نے سانحہ مشرقی پاکستان کے دوران بھی لوگوں کی مدد کی:

> "اب اس ناری کی داستان یہ تھی کہ واقعی سر پھری تھی۔ اس کے نانا، نانی تقسیم سے پہلے کوملا میں رہتے تھے۔ جو میانامتی گاؤں سے آٹھ میل دور شہر تھا اور بنگال کا شہر ہی کیا بجلی تو وہاں بھی خال خال ہی تھی اور یہ لڑکی بچپن سے اپنے نانا نانی کے پاس رہی۔"(۸۱)

بنگال کے معاشی حالات بہت خراب تھے خاص کر بنگال کے گاؤں کے اندر سقوطِ ڈھاکہ کے دوران لوگوں کو شدید مشکلات پیش آئیں۔ سقوطِ ڈھاکہ سے قبل اور بعد میں بنگال کی سر زمین سے جڑے گاؤں کے لوگوں کی معاشی حالت ابتر ہو گئی تھی۔ غربت نے ان گاؤں والوں کی زندگیوں کو اجیرن کر دیا تھا۔ خاص کر گاؤں کے اندر سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ بعض گاؤں میں بجلی تک کی سہولت نہیں تھیں۔ ایسے حالات کے باوجود بھی "سروج" اس زمین سے محبت کرتی تھی اور مشکل وقت میں بھی گاؤں کی عورتوں کو مفت تعلیم دیتی تھیں۔ نشاط فاطمہ نے "سروج" کے کردار کے ذریعے وطن سے دلی محبت کرنے والے کرداروں کی تصویر کشی کی ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے دوران مشرقی پاکستان میں آئے روز فسادات ہوتے تھے۔ لوگ بنگلہ دیش کے قیام

کے حامی تھے۔ وہ ملک دشمن سازشی عناصر کا شکار ہو گئے تھے۔ ایسے وقت میں متحدہ پاکستان کی بات کرنے والوں کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ان پر جاسوسی کے الزامات لگا کر تشدد کیا جاتا تھا:

"مشرقی بنگال جو کبھی مشرقی پاکستان تھا اور اب بنگلہ دیش ہے کے حالات اوپر تلے ہو رہے تھے وہاں ہر سمے جانے کا مطلب یہی ہوتا کہ لوگ شک وشبہ کرنے لگیں۔"(۸۲)

"سروج" کا کردار وطن سے محبت کرنے والا کردار ہے۔ بنگال کی زمین محب وطن لوگوں کے لیے تنگ ہو گئی تو "سروج" اور اس جیسی کئی خواتین نے اس مشکل اور نفسانفسی کے دور میں بھی ثابت قدمی کے ساتھ وطن کی خدمت کی۔ نشاط فاطمہ نے ایسے کرداروں کو مثال بنا کر پیش کیا تھا کہ حقیقی محبت کرنے والے تو وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جب ملک پر مشکل آئے تو ایسے حالات میں بھی لوگوں کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ وہ ایک مزدور کی حیثیت سے وطن کی تعمیر میں اپنا حصّہ ڈالتے رہتے ہیں۔ "سروج" اور اس جیسی بے مثال خواتین نے مشکل وقت میں بھی وطن کی خدمت کا کام جاری رکھ کر مثال قائم کر دی:

"دھان خود بوتے کاٹتے ہیں، کسانوں کو پڑھاتے ہیں اور ان کے معیار زندگی بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں، میں آپ کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہوں"(۸۳)

سقوطِ ڈھاکہ کے دوران جہاں مغربی پاکستان کے حالات خراب ہوئے وہاں بالخصوص بنگال کے اندر ہنگاموں اور فسادات کے نتیجے میں لوگوں کا کاروبار زندگی رک گیا۔ معیشت کا پہیہ جام ہونے سے ان کی مشکلات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ ایسے موقع پر بھی "سروج" اور اس جیسی بہادر خواتین نے لوگوں کی خدمت کا فیصلہ کر کے محب وطن ہونے کا ثبوت۔

۱۹۷۱ء کے دوران بنگال کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کا نقشہ بدل گیا۔ دل سوز واقعات اور فسادات نے بنگال کی سرزمین کا امن وسکون تباہ کر دیا۔ جس سے بنگالی لوگ مشکلات کا شکار ہوئے۔ نشاط فاطمہ نے اس افسانے میں زبردست انداز میں "سروج" اور اس جیسی دیگر خواتین کا ذکر کیا ہے جو اس مشکل گھڑی میں ثابت قدم رہیں:

" ۱۹۷۱ء میں جب حالات قابو سے باہر ہونے لگے تو باپو نے اسے گھر کا خطہ لکھ کر
بلوالیا۔ نہ صرف ماتا نے گھر سر پر اٹھالیا تھا بلکہ اس میں باپو نے دوست لارڈ نبٹلے کا بھی
ہاتھ تھا"(۸۴)

"سروج" کا ایسا کردار پیش کیا ہے کہ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے حالات جب شدید ابتر ہو گئے تو ایسے حالات میں "سروج" کے والد اور والدہ نے "سروج" کو بنگال کی سرزمین کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ وہ آنے والے خطرناک حالات سے آگاہ تھے۔ اس لیے "سروج" کو واپس بلانا چاہا۔ مگر "سروج" نے بنگال میں رہ کر مشکل وقت میں ان لوگوں کی خدمت کا سلسلہ جاری رکھا۔ جبکہ اس دوران حالات آئے روز قیامت کا منظر پیش کر رہے تھے۔

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے سانحہ کا بھی حل موجود تھا۔ مگر اس مسئلے کو حل کرنے کی بجائے اس کو طول دے کر ملک کو توڑ دیا گیا جو کہ قابل افسوس اور نا قابل فراموش واقع ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ قومی زندگی میں سیاہ باب کی طرح ہے۔ نشاط فاطمہ نے مشرقی پاکستان کے المیہ کو اپنے افسانے کے اندر موضوع بنایا ہے۔ بنگال سے جڑی تلخ یادوں کو "سروج" جیسی خواتین کے کردار کے ذریعے اُجاگر کرتی ہیں اور اپنے جذبات اور احساسات کو اس کردار کی زبانی پیش کرتی ہیں:

"۱۹۷۱ء میں اس نے اماں کو گھونس دی تھی اور لکھ رہا تھا کہ کلکتہ جا رہا ہے۔ نانا نانی نے
اسے دھمکی دی۔ اگر وہ ان کے ساتھ کلکتہ نہ گئی تو وہ باپو کو بلوائیں گئے "(۸۵)

بنگالی عوام کی منفی سوچ نے انھیں تباہ و برباد کر دیا۔ بالادست طبقے نے طاقت کے زور سے بنگال کے حالات خراب کیے۔ جب حالات دن بدن بگڑتے گئے تو ملک کی قیادت بھی ان حالات کو سلجھانے اور ان کا حل تلاش کرنے میں ناکام نظر آئی۔ عوام کی پسماندہ حالت کے ذمہ دار بھی یہی لوگ تھے۔ لوگ افلاس زدہ بھی تھے مگر کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں تھا۔ سخت مشقت کے باوجود لوگوں کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ تھی:

" سروج نے بہت سے بنگالیوں کے ساتھ اسے کھڑا دیکھا بالکل انھیں جیسا سانولا چھریرا
درمیانہ قد سیاہ بال اور اطاوس کی رات سے گہری کالی آنکھیں۔ یک لخت اسے خیال آیا
یہ اسی دیس کی مٹی سے بنا ہے۔ یہ مٹی خود اسے نہیں چھوڑے گی۔ "(۸۶)

نشاط فاطمہ نے "سروج" اور "سجاد" کے کرداروں کے ذریعے ملک سے حقیقی محبت کرنے والے اور ملک کی خدمت کرنے والے افراد کی نشاندی کر کے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اگر افراد متحد ہو کر ملک کی مشکلات کم کرتے تو سقوطِ ڈھاکہ جیسانا قابل فراموش واقعہ کبھی رونمانہ ہوتا۔

۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے حالات خراب کرنے میں بھارت نے اہم کردار ادا کیا۔ بھارت قیام پاکستان کے بعد مسلسل ہمارے ملک کو نقصان پہنچاتا رہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان کو ابتدائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مشکلات بھارت ہی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔ بھارت اور دیگر ملک دشمن عناصر کا خیال تھا کہ پاکستان کا قیام صرف چندماہ کے لیے ہے۔ اس کے بعد اس ملک کے حالات اس قدر کشیدہ ہو جائیں گئے کہ یہ لوگ بھوک اور افلاس سے تنگ آکر آپس میں ہی لڑ جھگڑ کر ختم ہو جائیں گئے۔ بچ جانے والے لوگ ہماری منت سماجت کریں گئے کہ وہ دوبارہ پاکستان کو بھارت کے ساتھ ملا دیں۔ ۱۹۷۱ء کے حالات کشیدہ کرنے کے لیے بھارت نے مشرقی پاکستان کے لوگوں میں نفرت پیدا کی اور مکتی باہنی ایک گرویلا تنظیم کی تشکیل دی اس تنظیم کی تشکیل ۱۹۶۹ء میں بھارتی فوج کے سابق جنرل اوبین نے ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دونیمی میں کی تھی۔ یہ ایک چھاپہ مار تنظیم تھی جس نے سقوطِ ڈھاکہ کے دوران پاکستان کے مشرقی صوبے میں لوگوں کے اندر نفرت پھیلائی۔ جس کی بدولت پاکستان کا مشرقی بازو الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔ اس حوالے سے بشیر احمد لکھتے ہیں:

> "ہندوں نے قیام پاکستان کے فوراً بعد مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں مغربی پاکستانیوں کے لیے نفرت کے بیج بونا شروع کر دیئے۔ اس سلسلے میں ہماری غلطیوں کوتائیوں اور اقدار کی ہوس نے ان کا کام آسان بنا دیا۔۔۔ دشمن نے ان معاملات کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جب کہ پاکستانی حکمرانوں نے ان مسائل پر توجہ دینے کی بجائے ان سے آنکھیں چرانے کا رویہ اختیار کیا اور دونوں حصّوں کے باسیوں کے درمیان نفرت کی دیواریں بڑھانا شروع ہو گیئں۔ نفرت کی یہ فصل ۱۹۷۱ء تک پوری طرح پک گئی اور آخر ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان کا مشرقی حصّہ مغربی حصے سے کٹ کر ایک علحدہ ملک بنگلہ دیش کی صورت میں دینا کے نقشے پر نمودار ہوا۔"(۸۷)

اس تنظیم نے اپنے ہم وطنوں اور بہاریوں کے قتل عام میں بڑھ چڑھ کا حصّہ لیا تھا۔ دہشت گردی اور

خوف کی نئی تاریخ رقم کر دی۔ عنایت اللہ رقمطراز ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی شکست در حقیقت سیاسی شکست تھی۔ اور اس میں فوج کو عسکری انداز سے استعمال ہی نہیں کیا گیا تھا۔ اس دور کی تاریخ پڑھیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ حکمران جان بوجھ کر قوم کو اس شکست کی طرف لے جا رہے تھے لیکن بد قسمتی کی بات یہ ہے قوم کے سامنے اس سانحے کی صحیح تصویر پیش کی ہی نہیں گئی تھی۔"(۸۸)

اس تنظیم کی کامیابی اس وجہ سے بھی ہوئی کہ ابتدا میں اس میں بنگالیوں کے ساتھ ساتھ بھارتی افواج کے جوان بھی شامل تھے۔ بھارتی افواج سے اس تنظیم نے گرویلا جنگ کی ٹریننگ حاصل کی تھی۔ مکتی باہنی اور بھارتی کماونڈز نے مشرقی پاکستان کے حالات خراب کرنے کے لیے قتل وغارت اور خون ریزی کے باب گرم کیے اور لوگوں کو نفرت کے لیے ابھارا۔ پاکستان کا خیال تھا کہ معاملات صحیح ہو جائیں گئے۔ اس لیے اس نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے بیچ نفرت کے جذبات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ حتٰی کے اس حوالے سے اخبارات کو بھی حکم دیا گیا کہ مشرقی پاکستان میں غیر بنگالیوں کی قتل عام کی خبریں شائع نہ کریں۔

اس دوران عورتوں کے اعضا کاٹے گئے۔ ان کی اجتماعی عصمت دری کی گئی۔ غیر بنگالیوں کو پکڑ کر چُن چُن کے قتل کیا گیا۔ مکتی باہنی کے ان مظالم کی بدولت پاکستان آرمی کو فوجی آپریشن کرنا پڑا۔ الغرض ۱۶ ستمبر تا ۲۸ ستمبر تک مکتی باہنی نے خوب قتل وغارت کا بازار گرم کر رکھا، غیر بنگالیوں کو انتقام کا نشانہ بنا کر ظلم کا بازار گرم کیا گیا۔

نشاط فاطمہ نے اپنے افسانے "دلِ گرفتہ لوگ" میں "بیگم شمس الحسن" کے کردار کے ذریعے ان کے اور ان کے خاندان کی بے بسی کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دنوں میں "بیگم شمس الحسن" اوران کے خاندان والے اپنی آٹھ کنال کی کھوٹی چھوڑ کر لندن میں اس لیے واپس چلے گئے کہ امن وامان کے بعد واپس پاکستان آجائیں گئے۔ امن وامان تو نہ آیا مگر وہ واپس بنگال میں جا کے بس گئے۔ یہاں انھوں نے جب امن وسکون کی زندگی گزارنا شروع کی تو سقوطِ ڈھاکہ کے دوران "مکتی باہنی" کے کارکنوں کی پر تشدد

کاروائیوں نے ان کا جینا محال کر دیا۔ مکتی باہنی کے کارکنوں نے چُن چُن کر غیر بنگالی لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ جس سے قتل وغارت کی فضا گرم ہوگئی ایک مرتبہ پھر "بیگم شمس الحسن" اور ان کے خاندان کو ہجرت کے کرب سے دوچار ہونا پڑا:

> " کبھی کبھی ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم آپ سے اپنا حال دل کہیں۔ آپ ہمارے متعلق کچھ بھی نہیں جانتیں۔ ہم ان بدنصیب لوگوں میں سے ہیں جو مشرقی پنجاب میں آٹھ کنال کوٹھی چھوڑ کر سنتیالیس (۱۹۴۷) میں کچھ دن کو لندن چلے گئے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ جب امن وامان ہو جائے گا ہم واپس چلے جائیں گئے۔ مگر جب ایسا نہ ہوا تو بنگال میں بس گئے، وہاں شمس نے بزنس شروع کیا خدا نے اتنی برکت دی کہ وہاں ہم بہت آرام بلکہ عیش سے رہ رہے تھے۔ پھر جب وہاں مکتی باہنی نے ناطہ بند کیا تو ہم سندھ آ گئے اور زمین خرید کر فارمنگ کرنے لگے مگر جانے تقدیر میں کیا غلطی تھی کہ اب وہاں سے بھی نکلنا پڑا۔ اب سوچتی ہوں کہ عمر اسی اکھاڑ پچھاڑ میں گزر گئی——"ان کی آواز میں بہت دکھ تھا"(۸۹)

نشاط فاطمہ نے سقوطِ ڈھاکہ کا ذمہ دار اپنے افسانے "دلِ گرفتہ لوگ" میں ایسے لوگوں کو بھی ٹھہرایا ہے جو اس وقت مشرقی پاکستان کے اندر مردوں اور عورتوں کو توہم پرستی میں مبتلا کر کے اپنوں ہی سے بیگانہ کر رہے تھے۔ ایسے لوگ حقیقت میں ملک دشمن عناصر کی مدد کر رہے تھے۔ وہ اپنوں کو اپنوں ہی کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔ توہم پرستی اور بدشگونی کے شکار افراد کچھ چیزوں، واقعات یا علامات کو اپنے لیے مبارک کی گھڑی سمجھتے ہیں اور دوسری طرف وہ کچھ چیزوں کو نقصان دہ تصور کرتے ہیں۔

جب لوگ توہم پرستی کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اپنی خوشیاں اور سکون برباد کر لیتے ہیں۔ ہر وقت مایوسی کا شکار رہتے ہیں۔ کہنے کے تو وہ سائنسی دور میں رہتے ہیں۔ الغرض ہر واقعے اور نظریے کے دلائل اور حقائق تلاش کیے جاتے ہیں مگر پھر بھی وہ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام میں رہ کر بھی توہم پرستی جیسے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ کم علمی اور ذہنی احکامات سے ناواقفیت ہے۔ دوسری بڑی وجہ برصغیر میں ہندوؤں کے ساتھ رہنا تھا جن میں توہم پرستی حد درجے سے زیادہ تھیں۔ نشاط فاطمہ نے "بیگم شمس الحسن" کے کردار کی کہانی

کے ذریعے سقوطِ ڈھاکہ جیسے سانحہ کا ذمہ دار اس بیمار معاشرے کو بھی ٹھہرایا ہے جو طویل عرصہ تک ہندوؤں کے ساتھ رہ کر توہم پرستی کا شکار ہوا تھا۔ وہ کم علم اور دین سے بھی لاتعلق تھے۔ اپنے علم اور دینی احکامات پر یقین رکھنے کے بجائے وہ بنگالی بابوں کی کئی ہوئی بات پر یقین رکھتے تھے اور اس کو ہی حرف آخر سمجھتے تھے۔ جب ملک دشمن عناصر کو کمزوری کا پتا چلا تو انھوں نے مختلف ذرائع سے مل کر توہم پرستی کی فضا کو ہوا دی۔ لوگوں کو داخلی سطح پر توہم پرستی اور وہم پرستی کا شکار کر کے ان کے دلوں میں وطن اور اہل وطن کے لیے نفرت کی آگ بھڑکا دی۔ ایسی آگ کی بدولت آہستہ آہستہ ایسی فضا قائم ہو گئی جس نے آنے والے وقتوں میں اپنوں کو اپنوں کے خلاف لا کھڑا کر دیا دیگر عناصر کے ساتھ ساتھ توہم پرستی کی وجہ سے لوگ نفسیاتی مسائل کا شکار ہو گئے۔ وہ حقائق کا سامنا کرنے کی بجائے ملک دشمن سازشوں کا شکار ہو گئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پتہ نہیں کیسے ان بنگالی عاملوں کی باتوں پر یقین کرنے لگے تھے۔ نشاط فاطمہ نے توہم پرستی کے اس سارے ماحول کو بھی سقوطِ ڈھاکہ کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ اس ہی فضا کی وجہ سے لوگوں کا ناطہ اپنوں اور ملک سے ایسے کٹ گیا تھا کہ ان کے اپنوں نے بڑی خون ریزی کی اور آپس میں اجڑتے بستے رہے:

> "ہمارے ابا کو بھی یقین نہیں تھا مگر ایک بار چٹاگانگ میں ہم جیب میں جا رہے تھے کہ بنگالی بابا پاس آ کھڑا ہو گیا۔ ہمارے ہاتھ دیکھے سوائے ابا کے کہنے لگا تم لوگ اُجڑتے بستے رہو گئے، بڑی خونریزی دیکھو گئے، بہت سفر ہے۔ اس نے پیسے بھی نہیں لیے، ابا نے اس کو ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔ مگر اب جب سندھ سے آئے ہیں اہ آکثر اس کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ ہاتھ کی ریکھاؤں میں سب کچھ لکھا ہوتا ہے۔ مجھے بھی یہی یقین ہے۔"(۹۰)

توہم پرستی ہر معاشرے میں موجود ہے۔ چاہے وہ مشرقی معاشرہ ہو یا مغربی معاشرہ لیکن سقوطِ ڈھاکہ کے دوران یہ بیماری بہت زیادہ پھیل گئی تھی۔ پڑھے لکھے لوگ بھی ان بنگالی عاملوں کی باتوں پر یقین کرنے لگے۔ اس طرح جب معاشرہ پوری طرح ان باتوں میں آ گیا تو موقع کا فائدہ اٹھا کر انھوں دشمن عناصر نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو مغربی پاکستان کے لوگوں کے خلاف ورغلایا اور مشرقی پاکستان کو جدا کرنے میں ہی ان کی عافیت بتائی۔ اس بدولت بھی ملک کے اندر ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ خاص کر مشرقی پاکستان کے رہنے والے

لوگ علیحدگی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے لگے۔ اس سے علیحدگی پسند تحریک کو قوت ملی اور اس قوت کی بدولت مشرقی پاکستان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو گیا۔

افسانہ "وہ ڈھونڈتی رہی" میں "سمیرا" کے کردار کے ذریعے اس کی آنکھوں کا براہ راست مشاہدہ ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے دوران لوگ نفسا نفسی کا شکار ہو گئے۔ ملک سے محبت ان کے دلوں سے ختم ہو گئی۔ اپنوں کا اپنوں پر اعتبار ہی نہیں رہا۔ لوگ محبت اور امن کے بجائے مال و دولت اور پیسوں کو ترجیح دینے لگے۔ لوگوں کے اندر خود غرضی، لالچ اور منافقت نے پرورش پانا شروع کر دی۔ "سمیرا" اس ساری صورتحال کی چشم دید گواہ ہے۔ وہ جانتی ہے کہ مخصوص حالات میں انسانی رویے کس طرح بدل رہے ہیں:

> "انہوں نے محبت اور امن کا پیسے سے سودا کر لیا ہے۔ یہ کہتا ہوا وہ بازار کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ پہلا اس کی تلاش میں نظر دوڑا رہا تھا کہ سن سے ایک گولی پہلے کے نہ جانے کہاں لگی وہاں تلاش بے سود اور جستجو ضفوں ہوتی ہے۔ پہلا دوسرے کو تلاش نہ کر سکا۔"(۹۱)

نشاط فاطمہ کے کردار جامد نہیں ہے۔ بلکہ بتدریج ارتقائی مراحل سے گزرتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو کٹھ پتلی کی طرح نہیں دکھاتی بلکہ ان کے کردار آزادانہ ماحول میں خود کو تبدیل کر کے پیش کرتے ہیں۔ "سمیرا" بھی ایک ایسی کردار ہے جو اس دور کے حالات و واقعات کی چشم دید گواہ ہے۔ اس ماحول میں رہ کر وہ لوگوں کی نفسیاتی کیفیت کو جان گئی تھی کہ وہ منہ سے کچھ اور دل سے کچھ سوچتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجوہات تھیں جب زمین سے رشتے نبھانے والے زمین کے ہی رشتوں سے نفرت کرنے لگ گئے۔ اس افسانے میں "سمیرا" ان لوگوں کی زندگیوں کی عکاسی کرتی ہیں جن کی وجہ سے سقوطِ ڈھاکہ جیسی نوبت آئی۔ ہجرت اور فسادات سے بھی ایسے لوگ کسی بھی طرح سے متاثر نہیں ہوئے۔ نشاط فاطمہ نے "سمیرا" کے کردار کے ذریعے سقوط ڈھاکہ میں مشرقی پاکستان کی نازک اور ابتر صورتحال اور حالات و واقعات کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ انسان کے اندر بربادی، مروت، دوسروں کی خدمت، احساس شناسی اور احساسیت جیسے جذبات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ملک کے اندر امن ہو، جب ملک سے محبت کرنے والے لوگ ہر وقت ملک کا بھلا چاہیں

اور ان کے اندر جھوٹی انا اور میں کا خاتمہ ہو۔ لیکن سقوطِ ڈھاکہ کے دوران "سمیرا" نے ایسے حالات دیکھے جب ملک کے اندر افراتفری تھی۔ سلیقہ شعاری کا نام ونشان نہیں تھا۔ محبت کا جذبہ ختم ہو رہا تھا:

> "سمیرا نے تو اس بدنصیب کو منع بھی کیا تھا۔ کہا تھا آج کالج سے چھٹی ہے مت جاؤ پر اس نے سُنا کب اول جلول لڑکا نکل کھڑا ہوا کسے معلوم تھا کہ شہر یاراں دیکتے سلگتے جنم میں تبدیل ہو جائے گا۔ شہروں میں رہنے والوں کو ان پر بڑا ناز وارمان ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے شہر ہو قصبہ ہو یا قریہ اپنے باسیوں کے لیے ایک مضبوط قلعہ ہوتا ہے مگر اب صورت یہ تھی کہ ایک شہر دار دوسرے کی گھات میں تھا اور شہر حیران ویران تھا نہ بوئے دوست تھی اور نہ آواز دوست"(۹۲)

محبت کی وجہ سے ملک کے اندر امن آتا ہے۔ محبت سے لوگ جڑ جاتے ہیں یہ محبت کا خاصہ ہے یہ ایک شخص یا انسان تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس کا دائرہ ساری کائنات تک وسیع ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ میں محبت کی جگہ نفرت نے لے لی تھی۔ امن کی جگہ دکھ آ گیا تھا۔ الغرض اس طرح کا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا کہ شہر میں ہر کوئی دوسرے کی گھات میں رہتا تھا۔ شہر ویران اور سنسان ہو گئے تھے۔ کوئی دوست دوستی کے قابل نہیں رہا تھا۔ شہروں میں رہنے والوں کو جن پر بڑا ناز ہوتا تھا وہ ان ہی سے ڈرنے لگے۔ نشاط فاطمہ نے اس ساری خوف زدہ صورتحال کی عکاسی "سمیرا" کے کردار کے ذریعے کی ہے جو ان سارے حالات کی چشم دید گواہ ہے۔

افسانہ "وہ ڈھونڈتی رہی" میں "ناہید" کے کردار کے ذریعے سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں کراچی کی مجموعی صورتحال کی تصویر کشی کی ہے۔ ان کے افسانے میں ایک موضوع کراچی کی بدامنی ہے وہ ان افسانوں میں کراچی کی صورتحال کی چشم دید گواہ ہے۔ دہشت گردی کی مجموعی صورتحال نے کراچی کے بچوں اور بوڑھوں پر خوف کے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس دہشت گردی میں بم دھماکے اور خودکشی جیسے نتائج سامنے آئے تھے۔ کراچی کے اقتصادی اور سماجی حالات میں بگاڑ تھا:

> "ناہید حیدر کا اٹھنے بیٹھنے ہی کہنا تھا ملکہ اصرار تھا کہ گناہگاروں کی بستیوں پر اب عذاب اسی طرح نازل ہوتے ہیں جیسے بروت ہر عذاب ٹوٹا تو بھائی اب ان بچوں کا بھی دھیان

کیجیے جو پیاس سے نڈھال اور زخموں سے چور تھے جو دکھیا نہیں جاتے تھے کہ گناہ کیا ہے"(۹۳)

ملک دشمن عناصر نے کراچی جیسے اہم شہر کو معاشی اور اقتصادی حوالے سے ٹارگٹ بنایا تھا۔ ان ملک دشمن عناصر کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر چکی تھی۔ شہادت کی تخریب، پر تاثیر گفتگو، غلط اور غیر اسلامی ترجیحات اور روپے پیسوں کے لالچ کے ذریعے لوگوں کو ملک توڑنے کے لیے اور ملک میں خوف کی فضا قائم کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔ "ناہید" کا کردار اس حوالے سے افسوس کرتا ہے کہ کراچی میں اخلاقی اقدار زوال پذیر ہو گیا تھا اور مادیت لوگوں کے دلوں میں نافذ کر دی گئی تھی۔ الغرض انسان انسانیت کے مرتبے سے گر گیا تھا۔ اس ساری صورتحال نے بچوں کی نفسیات پر بھی بہت گہرا اثر ڈالا۔ نشاط فاطمہ "ناہید" کے کردار کے ذریعے یہ بتانا چاہتی ہے کہ وہ بچے جو ابھی کلی تھے، جن کو پھول بننا تھا وہ پھول بننے سے پہلے ہی مرجھا گئے تھے۔

کراچی کے اندر خوف کی فضا پھیلانے کے لیے منظم انداز میں جال بچھایا گیا۔ سب سے زیادہ متاثر ہونے وہ لوگ تھے جو کم عمر اور نہ پختہ جذبات رکھنے والے تھے۔ نشاط فاطمہ نے افسانہ "وہ ڈھونڈتی رہی" میں "ثروت" کے کردار کے ذریعے دہشت گردی کے محرکات اور اصل اسباب کے حوالے سے بتایا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ اس ملک کا المیہ یہ ہے کہ ہر طرف لاقانونیت نظر آرہی ہے۔ بے شمار مجرم ایسے ہیں جو جرم کرنے کے بعد بھی آزادانہ گھوم پھر رہے ہیں۔ "ثروت" نے یہ ساری صورتحال اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ اس پر خون کے آنسو روتی ہیں:

> "ثروت باجی اپنا سامان باندھتی تھیں اور مایوسی سے سیریلا کر کہتی تھیں، ہائے ہمارا شہر تو ایسا ہو گیا جیسے چمن کو خزاں نے لوٹ لیا ہو اور ہر سو سرخ سرخ لالے کے پھول ٹوٹ ٹوٹ کر بکھیر گئے ہوں جب اپنے پیاروں کا خون یوں ارزاں ہو کر سڑکوں پر بہنے لگے تو سمجھ لیجیے کہ شہر نے اپنی حرمت کھو دی"(۹۴)

دہشت گردوں نے سقوطِ ڈھاکہ کے دوران کراچی جیسے اہم شہر کے اندر بھی خون کی ہولی کھیل کر جرم کی نئی نئی داستانیں سامنے لائیں۔ بچوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ان کی معصومیت کا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ "ثروت" کا کردار بتاتا ہے کہ معصوم لوگ دشمن قوتوں کے ہاتھوں کس طرح آسانی سے یرغمال ہو گئے۔

شہر کی پر سکون فضالوگوں کے لیے بے سکون فضابن گئی۔ سڑکوں، پارکوں، ہسپتالوں بلکہ ہر جگہ حالات اس قدر خراب ہوئے کہ لوگ ذہنی اذیت سے دوچار ہو گئے۔ "ثروت" کا کردار یہ کہتا ہے کہ شہر کی فضا کو زہریلا کرنے میں اور بے سکون بنانے میں سیاسی پارٹیوں اور لیڈروں کا بھی بڑا اہم کردار تھا۔

افسانہ "وہ چلی پیا کے دیس" میں نشاط فاطمہ نے "بختاور بیگم" کے کردار کے ذریعے ہجرت کے کرب سے دوچار دو خاندانوں کی دکھ بھری کہانی پیش کی ہے۔ جب پاکستان اور بھارت معرض وجود میں آئے تو دونوں طرف سے لوگوں نے ہجرت کی۔ اس ہجرت کے دوران "بختاور بیگم" اور اس کے اہل خانہ پاکستان میں مقیم رہے جب کہ اس کی دوسری بہن "حسنہ باجی" اور اس کے خاندان والے بھارت میں مقیم تھے۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے سے محبت کا دم بھرتی تھیں۔ جب دونوں کے بچے بڑے ہوئے تو پاکستان میں مقیم "بختاور بیگم" نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بیٹی "انجو" کی شادی اپنی بہن "حسنہ باجی" کے بیٹے "امتیاز" سے کرے گی جو محکمہ زراعت میں آفیسر تھے "بختاور بیگم" کو اس کے سب رشتہ داروں اور بیٹے نے بہت سمجھایا کہ سرحد کے دونوں طرف حالات ٹھیک نہیں ہے۔ لہذا "انجمن آرا" کی شادی پاکستان میں کر دی جائے۔

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔ تاہم "بختاور بیگم" کے اصرار پر سارے گھر والے بھارت میں گئے اور "انجمن آرا" کی شادی "حسنہ باجی" کے بیٹے امتیاز سے کر دی۔ ایک مہینہ ختم ہونے کے بعد "انجو" پاکستان واپس آگئی اور مستقل ویزے کے لیے درخواست دی۔ ۱۹۶۵ء میں ویزا پالیسی پر سختی ہو گئی۔ بعد میں سقوطِ ڈھاکہ کے واقعے کی وجہ سے ویزے پر مکمل پابندی لگ گئی۔ اس دوران "انجمن آرا" کی والدہ "بختاور بیگم" بہت پریشان ہو گئیں مگر حالات کے ہاتھوں مجبور تھیں:

> "اماں کیا جواب دیتیں۔ خود ان کی صحت گر رہی تھی، اماں محروم اسی غم میں سدھار چکے تھے۔ ٹھنڈی سانسیں بڑھ کر چپ ہو جاتی۔ اور یہاں یہ کہ جہاں کھٹ پٹ ہوئی۔ ۱۹۶۵ میں ویزے بند۔ ۱۹۷۱ء میں ویزے ختم"(۹۵)

نشاط فاطمہ سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں ان حالات وواقعات کی تصویر کشی اپنے افسانے "وہ چلی پیا کے دیس" میں کرتی ہیں ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ نے اپنے خاندانوں سے بچھڑنے والوں کو ہمیشہ کے لیے ایک

دوسرے سے الگ کر دیا۔ انھوں نے "بختاور بیگم" کے کردار کے ذریعے ایسے لوگوں کے حالات کو ہمارے سامنے لایا ہے کہ جب ۱۹۷۱ء میں ویزے ختم کر دیے گئے اور دونوں طرف ایک دوسرے کے ملکوں میں آنے پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ تو "بختاور بیگم" اور اس جیسے کئی خاندانوں کی بیٹیاں ویزوں کی ختم ہونے کی وجہ سے شادی کے بعد اجڑ گئیں۔ یہاں تک اس کی بیٹی بوڑھی ہو گئی مگر اپنے خاوند سے نہ مل سکی۔ اس چیز نے اسے ذہنی اذیت سے دوچار کر دیا:

> "اور اماں تھیں کہ ویزہ آفیسر کو دن رات کوس رہی تھیں جیسے اس کے حکم سے شادی ہوئی ہو، اور اب وہ ویزہ نہ دے رہا ہو۔"(۹۶)

۱۹۶۵ء پاک بھارت جنگ کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان دوریاں ہو گئیں اس دوران ویزہ پالیسی بھی سخت ہو گئی۔ لیکن جب ۱۹۷۱ء کے دوران سقوطِ ڈھاکہ کا واقعہ پیش آیا تو دونوں ملکوں میں غیر معینہ مدت کے لیے ویزے ختم کر دیے گئے۔ اس دوران "بختاور بیگم" اپنی بیٹی کے لیے پریشان رہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ ان کی بیٹی بھارت جا کر اپنے شوہر "امتیاز" کے ساتھ رہے۔ مگر ویزے ختم ہونے سے آئے روز اپنی بیٹی اور اس کے مستقبل کے لیے پریشان رہتی۔ نشاط فاطمہ "بختاور بیگم" کے کردار کے ذریعے ایسے کئی خاندانوں کی روداد سناتی ہیں جو ۱۹۷۱ء میں غیر معینہ مدت کے لیے ویزے ختم ہونے کی وجہ سے پریشانیوں اور مصیبتوں میں رہے۔

افسانہ "وہ چلی پیا کے دیس" میں "انجمن آرا" عرف "انجو" کے کردار کے ذریعے ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے جو ۱۹۷۱ء میں غیر معینہ مدت کے لیے ویزے ختم ہونے کی وجہ سے پاکستان اور بھارت دونوں کے شہریوں کو برداشت کرنے پڑے، "انجمن آرا" ایک ایسی کردار ہے جو اپنی والدہ کی مرضی سے اپنی خالہ کے بیٹے "امتیاز" سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی۔ امتیاز اور اس کے خاندان والے بھارت میں مقیم تھے۔ عارضی ویزے پر کچھ دن اور کچھ مہینے بھارت میں گزرا کر واپس پاکستان آکر مستقل ویزے کے لیے درخواست دی۔ مگر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ اور بعد میں ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے تنازعہ کی وجہ سے دونوں ملکوں میں ویزے پر پابندی لگ جاتی ہے۔ اس سے "انجمن آرا" کی پریشانی بڑھ جاتی ہے اور وہ امتیاز سے چاہ کر بھی نہیں مل سکتی۔ ۱۹۷۱ء کے سقوطِ ڈھاکہ کے سانحے نے "انجمن آرا" اور اس جیسے کئی خاندانوں کی

زندگیاں تباہ کر دیں جو سرحد پار دونوں طرف اس کی صورتحال سے دوچار تھے:

"وہ انجمن آرا جو خیال تھیں اور جو خواب میں چلتی تھیں۔۔۔ چڑچڑی ذرا اپنی عمر سے کہیں بڑی لگتی تھیں۔ اکثر وہ ٹھنڈی سانس کھینچ کر منہ میں کہتی۔ آہ کو چاہیئے ایک عمر اثر ہونے تک" جانے ان کے ستارے ان کے خلاف کیوں ہو گئے۔"(۹۷)

اپنوں کی محبت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنوں سے دور ہوتا ہے۔ اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ رہتے ہوتے ہوئے اکثر اس کی چاہت اور محبت کا احساس نہیں ہوتا۔ انجمن آرا شادی کے بعد جب امتیاز سے جدا ہو گئی تو بہت پریشان رہنے لگی۔ انتظار کی یہ کیفیت اسے موت جیسی تکلیف دینے لگی۔ نشاط فاطمہ نے ۱۹۷۱ء میں ویزے ختم ہونے سے ایسے کئی لوگوں کی دکھی داستان سنائی ہے۔

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے حالات نے پاکستان اور بھارت کے لوگوں کے درمیان نفرت کو ہوا دی۔ اس دوران جہاں دو ملکوں کے درمیان حالات کشیدہ ہوئے۔ وہاں سرحد پار دونوں طرف "انجمن آرا" اور اس جیسی کئی خواتین کی زندگیاں برباد ہوئیں۔ وہ چاہا کر بھی اپنی ازدواجی زندگی کا رشتہ نہیں نبھا سکیں۔ ویزہ پالیسی بند ہونے کی وجہ سے اس کی امیدیں دم توڑ گئیں۔ اس کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ ذہنی کرب میں مبتلا ہو گئی:

"انجمن آرا کو تو ایسا لگا کہ جیسے سرحدیں لوہے کی ہو گئی ہوں۔ ہتھیاروں کی جھنکار آ رہی ہو اور بارود کا دھواں پھیل رہا ہو۔۔۔ وہ ایک اینٹ اٹھا کر ویزا آفس کی دیوار پر پل پڑیں۔"(۹۸)

سیاسی حالات کی کشیدگی نے پاکستان اور بھارت کے اندر اپنوں کو ہمیشہ اپنوں سے جدا کر دیا۔ دونوں ملکوں کے تعلقات آئے روز اس قدر کشیدہ ہوئے کہ جس سے "انجمن آرا" جیسی کئی خواتین کے گھر اجڑ گئے۔ "انجمن آرا" کو جب اپنے محبوب سے ملنے کی امید ختم ہوتی ہوئی نظر آئی تو اس نے تخیل کی زندگی جینے کا فیصلہ کیا۔ وہ تخیل میں اپنے محبوب سے ملاقات کرتی اور تخیل میں اپنا گھر بسانے میں مجبور ہو گئی:

"دوسری رات انھوں نے خواب میں دیکھا ساون کی بھر کھا برس رہی ہے۔ باغوں میں کوئل بول رہی ہے اور امتیاز مسکرا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں دو گجرے ہیں جو وہ

انہیں پیش کر رہے ہیں۔ صبح اٹھ کر انہوں نے خود ہی تعبیر لی اور بڑے ولولے سے تیار
ہو کر ویزا آفس پہنچیں۔"(۹۹)

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے حالات نے لوگوں کے دلوں میں اس قدر نفرت پیدا کر دی کہ وہ چاہا کر بھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے تھے۔ اب ان کے ملن کی ایک صورت باقی بچ گئی تھی کہ وہ تخیل کی دنیا بسا لے نشاط فاطمہ نے "انجمن آرا" کے کردار کے ذریعے کئی خاندانوں کا دکھ بیان کیا ہے۔

"قمر سلطانی" افسانہ "حرف امر ہو گئے" میں ایک نسوانی کردار ہے۔ جو اپنے کردار کے ذریعے ۱۹۷۱ء کا سانحہ سقوطِ ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کے حالات کو ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ وہ مسلمانوں کی بے بسی پر خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ "قمر سلطانی" قیام پاکستان کے بعد ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان آئیں۔ ہجرت کے دوران انھوں نے اور اس کے خاندان والوں نے فسادات اور قتل وغارت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ "قمر سلطانی" ایک حساس طبیعت کی مالک خاتون ہیں۔ وہ تحریک آزدی نسواں کی حامی ہیں۔ معاشرے کی ترقی میں مردوں کے ساتھ خواتین کے کردار کو بھی اہم سمجھتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خواتین کو بھی مسلمانوں کی مشکلات کم کرنے کے لیے اپنے کردار کو ادا کرنا ہو گا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران "قمر سلطانی" نے خواتین کے ساتھ مل کر ایک مہم چلائی۔ انھوں نے خواتین کی مدد سے چندہ اکٹھا کیا۔ ادویات کے لیے فنڈ اکٹھا کیا اور آس پاس کی عورتوں سے سوئیٹر بنوائے اور سپاہیوں کو بھجوائے۔ انھوں نے سب خواتین سے التماس کی کہ اللہ کے حضور سر بسجود ہو کر پاک فوج کے جوانوں کی سلامتی اور کامیابی کے لیے دعائیں کریں۔ نشاط فاطمہ نے جذبہ حب الوطن سے سرشار "قمر سلطانی" اور اس جیسی محب وطن خواتین کے جذبوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

"انیس سو پینسٹھ کی جنگ میں انہوں نے خود اور جہلم میں آس پڑوس کی بیویوں سے
سوئیٹر بنوائے اور سپاہیوں کو بھجوائے اور ان کے لیے سلامتی کی دعائی کیں۔ وہ جی
دار اور جذبے والی خاتون تھیں"(۱۰۰)

خواتین معاشرے کی اہم رکن ہیں۔ خواتین کا کردار ہر زمانے میں مثالی رہا ہے۔ خواتین نے ہر میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر کے قوموں کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ سقوطِ ڈھاکہ سے قبل ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں دشمن پاکستان کو ختم کرنے کی سازش کر رہے تھے۔ ایسے

میں "قمر سلطانی" اور اس جیسی کئی محب وطن خواتین نے ملک کے دفاع کی خاطر اپنا حصّہ ڈالا تھا۔ انھوں نے خواتین کی خدمات حاصل کر کے پاک فوج کے جوانوں کی مدد کی۔ ان کے اس جذبے اور حوصلے کی بدولت ملک بڑی تباہی سے بچ گیا۔ ایسی خواتین کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جاتی ہیں۔ ایسی خواتین ملک کا فخر اور سرمایہ ہوتی ہیں۔ نشاط فاطمہ نے "قمر سلطانی" کے نسائی کردار کے ذریعے سانحہ سقوطِ ڈھاکہ کی دردناک کہانی کی منظر کشی کی ہے اور ایسے لوگوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جن کی آنکھوں کے سامنے خون ریزی ہو رہی تھی، قتل وغارت کی فضا گرم تھی، لوگوں کو لوٹا جا رہا تھا، ملک میں افراتفری کی کیفیت پیدا کی جا رہی تھی اور ملک کو توڑنے کی سازشیں کی جا رہیں تھیں۔ ایسے لوگوں نے آنکھیں بند کی ہوئیں تھیں۔ وہ دیکھے کو آن دیکھا کر رہے تھے۔ حکمران دنیاوی عیش وآرام کے مزے لوٹ رہے تھے۔ ایسے میں دشمن اپنی سازش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انھیں اپنا راستہ صاف ہوتا ہوا نظر آیا۔ انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو مسلمانوں کے سامنے لا کھڑا کیا اور اپنوں سے اپنوں کو قتل کروا کر فسادات کی فضا گرم کی:

> "معلوم نہیں تم سمجھو گئی یا نہیں بہر حال میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔ دیکھو بھائی جب بنگال میں بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا تب بھی شادی کی محفلیں سج رہی تھیں۔۔۔ خون بہہ رہا ہے وہی دھما چوکڑی، بے جا اصراف اور بے پرواہی جو مرتا ہے مرے ہمیں کیا"(۱۰۱)

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام اور اسلامی شعائر کے خلاف جب بھی اور جہاں بھی کچھ ہوتا ہے تو ایک عام مسلمان کے اندر بھی سوئی ہوئی غیرت بیدار ہو جاتی ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے دوران ملک کے حالات بیگانہ ہوتے ہوئے نظر آئے۔ "قمر سلطانی" جب خواتین کو مسلمانوں کے درد کی کہانی سناتی اور مسلمانوں کی مدد کے لیے ان کے کردار کی اہمیت ان کے سامنے واضح کرتی تو وہ اس کا مذاق اڑاتی اور محلے والوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دیتیں۔ سانحہ سقوطِ ڈھاکہ میں مشرقی پاکستان کے دوران بھی ایسے بے حس مرد موجود تھے جنھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ملک کو تقسیم ہوتا ہوا دیکھا۔ لیکن ان کی شخصیت پر ذرا برابر بھی اس کا اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنی عیش وآرام کی زندگی میں مست نظر آئے۔ خون بہتا رہا۔ دھماکے ہوتے رہے، مگر ایسے لوگ

بے جا اصراف اور عیش پرستی میں مگن رہے۔ نشاط فاطمہ نے ایسے ملکی باشندوں کے کرداروں کی زندگیوں پر افسوس اور رنج کا اظہار کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، اردو مرکزیت گینت روڑ، لاہور، س ن، ص ۱۰۸

۲۔ عبد القادر سروری، کردار اور افسانہ یعنی دینائے افسانہ، مکتبہ ابراہمیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹، ص ۵۲

۳۔ عذرا لیاقت، بیسویں صدی کی نمائندہ افسانوی نثر نگار خواتین: ایک جائزہ، غیر مطبوعہ (مقالہ برائے ایم۔فل)، علامہ اقبال یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۵

۴۔ نشاط فاطمہ، گم کردہ راہِ منزل، مشمولہ انسان کی تلاش، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸، ص ۸

۵۔ ایضاً، ص ۷

۶۔ ایضاً، ص ۷

۷۔ ایضاً، ص ۷

۸۔ ایضاً، ص ۱۰

۹۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۰۔ ایضاً، ص ۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۸

۱۹۔ ایضاً، ۱۹

۲۰۔ ایضاً، ۱۸

۲۱۔ نازیہ ملک، پاکستانی اردو افسانے میں عصری آگہی: تجزیاتی مطالعہ، نیشنل یونیورسٹی ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۴، ص ۵۷

۲۲۔ نشاط فاطمہ، گم کردہ راہِ منزل، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۱۹

۲۳۔ نشاط فاطمہ، انسان کی تلاش، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۲۰

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۰

۲۵۔ جہاں آرا امام، تدوین تعارف (احمد سلیم) اکہتر کے وہ دن، جمہوری پبلیکشنز، س ن، ص ۳۴

۲۶۔ نشاط فاطمہ، انسان کی تلاش، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۲۱

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۳

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۵

۲۹۔ نشاط فاطمہ، مزدور، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۱۷۸

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۳۳۔ نشاط فاطمہ، ایک پتہ، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۱۸۹

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۸۶

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۸۷

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۳۸۔ عنایت اللہ، دو پلوں کی کہانی، (ستمبر ۱۹۶۵ء ۱۹۷۱ء) کی جنگی کہانیوں کا مجموعہ، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء ص ۵۱۱

۳۹۔ نشاط فاطمہ، آج کے غم کے نام، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۱۹۴

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۹۷

۴۱۔ ایضاً، ص۱۹۷

۴۲۔ ایضاً، ص۱۹۷

۴۳۔ ایضاً، ص۱۹۹

۴۴۔ ایضاً، ص۲۰۰

۴۶۔ ایضاً، ص۲۰۱

۴۷۔ ایضاً، ص۲۰۴

۴۸۔ ایضاً، ص۲۰۵

۴۹۔ ایضاً، ص۲۰۵

۵۰۔ ایضاً، ص۲۰۵

۵۱۔ ایضاً، ص۱۹۸

۵۲۔ ایضاً، ص۱۹۸

۵۳۔ ایضاً، ص۱۹۸

۵۴۔ ایضاً، ص۲۰۰

۵۵۔ نشاط فاطمہ، آج کے غم کے نام، مشمولہ انسان کی تلاش، ص۱۹۷

۵۶۔ نشاط فاطمہ، دل گرفتہ لوگ، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص۲۵

۵۷۔ حمزہ علوی، پاکستانی اشرفیہ فوج اور نوکر شاہی، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۴، ص۱۹۰

۵۸۔ ایضاً، ص۲۸

۵۹۔ نشاط فاطمہ، ایک ساعت، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص۵۰

۶۰۔ نشاط فاطمہ، وقت فتنہ گر، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص۲۱۶

۶۱۔ ایضاً، ص۲۱۵

۶۲۔ نشاط فاطمہ، گم کردہ راہِ منزل، مشمولہ انسان، کی تلاش، ص۱۴

۶۳۔ ایضاً، ص۱۴

۶۴۔ ایضاً، ص۱۸

۶۵۔ نشاط فاطمہ، انسان کی تلاش، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۲۴

۶۶۔ ایضاً، ص۲۵

۶۷۔ ایضاً، ص۲۳

۶۸۔ نشاط فاطمہ، بھر بھری ریت کا طوفان، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۳۳

۶۹۔ نشاط فاطمہ، وقت کی صلیب، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۷۰

۷۰۔ ایضاً، ص۶۶

۷۱۔ ایضاً، ص۶۸

۷۲۔ ایضاً، ص۶۹

۷۳۔ ایضاً، ص۶۹

۷۴۔ ایضاً، ص۷۰

۷۵۔ نشاط فاطمہ، مزدور، مشمولہ انسان کی تلاش، ص ۱۸۳

۷۶۔ ایضاً، ص۱۸۴

۷۷۔ ایضاً، ص۱۸۴

۷۸۔ نشاط فاطمہ، ایک پتہ، مشمولہ انسان کی تلاش، ص۱۸۹

۷۹۔ ایضاً، ص۱۹۰

۸۰۔ نشاط فاطمہ، آج کے غم کے نام، مشمولہ انسان کی تلاش، ص۱۹۶

۸۱۔ ایضاً، ص۱۹۷

۸۲۔ ایضاً، ص۱۹۷

۸۳۔ ایضاً، ص۲۰۱

۸۴۔ ایضاً، ص۲۰۲

۸۵۔ ایضاً، ص۲۰۳

۸۶۔ ایضاً، ص۲۰۵

۸۷۔ ایضاً، ص۲۰۶

۸۸۔ بشیر احمد، اردو نثر پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو) اورنٹیل کالج، لاہور، ۲۰۰۸

۸۹۔ عنایت اللہ، دو پلوں کی کہانی، (ستمبر ۱۹۶۵ء ۱۹۷۱ء) کی جنگی کہانیوں کا مجموعہ) علم عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۶۷

۹۰۔ نشاط فاطمہ، دل گرفتہ لوگ، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص۲۸

۹۱۔ ایضاً، ص۲۹

۹۲۔ نشاط فاطمہ، وہ ڈھونڈتی رہی، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص۴۰

۹۳۔ ایضاً، ص۴۰

۹۴۔ ایضاً، ص۴۱

۹۵۔ ایضاً، ص۴۱

۹۶۔ نشاط فاطمہ، وہ چلی پیا کے دیس، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص۱۰۱

۹۷۔ ایضاً، ص۱۰۲

۹۸۔ ایضاً، ص۱۰۱

۹۹۔ ایضاً، ص۱۰۸

۱۰۰۔ ایضاً، ص۱۰۸

۱۰۱۔ نشاط فاطمہ، حرفِ امر ہو گئے، مشمولہ چاند ڈوب گیا، ص۱۶۸

۱۰۲۔ ایضاً، ص۱۷۴

باب چہارم

ماحصل

الف) مجموعی جائزہ

نشاط فاطمہ اپنے دور کی نمائندہ افسانہ نگاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ نشاط فاطمہ کا نام اردو افسانے اور ناول کی تاریخ میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ تخلیقی ہنر نشاط فاطمہ کو ورثے میں ملا تھا۔ ان کے دادھیال اور ننھیال میں کئی نامور ادیب اور شاعر گزرے ہیں۔ علم وادب کی ایک مستحکم روایت ان کے خاندان میں موجود تھی۔ تعلیم وتربیت میں ان کی والدہ کا خاص کردار رہا ہے۔ نشاط فاطمہ کی والدہ نے ابتدا ہی سے اپنے بچوں میں علم کی لگن پیدا کی ہے۔ مختلف کہانیاں سنا کر ان کی تربیت میں منفرد کردار ادا کیا۔ ان کی والدہ نے گھر ہی میں ایک استاد کے ذریعے فارسی کی تعلیم دلوائی، ان کی طرز فکر پر چھوٹی چھوٹی کہانی نما حکایتوں نے گہرا اثر ڈالا۔ ان کی ذہنی نشوونما کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ نشاط فاطمہ نے علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ نشاط فاطمہ ایک سلیقہ مند اور احساس طبیعت کی مالک خاتون تھیں۔

ادب سے دلچسپی نشاط فاطمہ کو بچپن سے ہی تھی۔ سکول میں باقاعدہ تعلیم کے آغاز سے پہلے ہی فارسی کی تعلیم حاصل کرلی تھی۔ کم عمری میں ہی "بوستان" اور "گلستان" پڑھ لی تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کا ذہن تخلیقی صلاحیت سے لبریز ہو گیا۔ لکھنے کا آغاز نشاط فاطمہ نے اس وقت کیا جب رومانوی اور ترقی پسند تحریک کا گرد وغبار پورے برصغیر پر اپنے اثرات ڈالنے کے بعد تھم چکا تھا۔ خصوصا ترقی پسند تحریک کے اثرات ختم ہو رہے تھے۔ اور ان تحریکوں کے خلاف رد عمل بھی شدید ہو رہا تھا۔ ان حالات میں جیلانی بانو، واجدہ تبسم، جمیلہ ہاشمی اور الطاف فاطمہ جیسی خواتین نے جہاں میدان میں قدم رکھا وہیں نشاط فاطمہ نے بھی دوسری خواتین افسانہ نگاروں کی طرح ادب کے میدان میں قدم رکھ کر بہت جلد ایک خاص مقام حاصل کرلیا۔ ادب کے میدان میں جب یہ خواتین داخل ہوئیں تو ہر طرف جمود کا نعرہ ادب میں بلند کیا جارہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ادیبوں کے پاس موضوعات ختم ہو رہے ہیں۔ لیکن تمام ادیب مجموعی طور پر ہر طرح کی صورتحال کی عکاسی کرنے سے

قاصر تھے۔ ان حالات میں انہوں نے لکھنے کا آغاز کیا۔ وہ مجموعی صورتحال کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف حالات کو قلمبند کرتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ ایک تازگی کا احساس ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ فرسودگی جو پرانے ادیبوں پر چھائی ہوئی تھی اس کے رد عمل کے طور پر ہمیں ایک تازگی اور واضح جدت کا احساس ہوتا ہے۔ افسانہ نگاری ایک ذمہ داری اور سہولت کا کام ہے۔ کہانی کو اس انداز سے پیش کرنا کہ وہ قاری کی دلچسپی کا محور بن جائے، قاری کہانی پڑھ کر لطف اندوز ہو، کہانی کو اس انداز سے پیش کرنا کہ واضح اور مختصر طور پر ان حالات کی عکاسی ہو جائے یہ ان کا کمال فن ہے۔

نشاط فاطمہ نے بھی اظہار کے لیے افسانے اور ناول کو اپنایا۔ تقریبا چالیس برس تک بے تھکان لکھا۔ نشاط فاطمہ نے اس طویل عرصے میں چار ناول اور تقریبا پینتالیس کے قریب افسانے لکھے۔ ان کے ناولوں میں سنہری گہیوں، آنسو جو بہہ نہ سکے، زمین کے رشتے، پھول گرتے رہے شامل رہے ہیں۔ اور ان کے دو افسانوی مجموعے "انسان کی تلاش" اور "چاند ڈوب گیا" شامل ہیں۔ ان افسانوی میں مقدار کے ساتھ معیار پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ فنی اور موضوعاتی حوالوں سے ایک خاص معیار ان کی تخلیقات میں موجود ہے۔ نشاط فاطمہ بھی افسانہ نگاروں کے اسی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں جن کے مسائل یکساں ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں انہی موضوعات کو بنیاد بنایا ہے جو اس دور کے دوسرے ادیبوں کے ہاں بھی موجود ہے۔ مثلاً حسن و عشق، سماجی، معاشرتی اور سیاسی مسائل وغیرہ۔ لیکن ان تمام موضوعات پر انہوں نے منفرد انداز سے قلم اٹھایا ہے اور ان بنیادی موضوعات کے بطن سے ضمنی موضوعات کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ دوسرے تمام ادیبوں کے ہجوم میں اپنی ایک علیحدہ شناخت قائم کی۔ ان کی کہانیوں کے بنیادی موضوعات معاشی رجحان، سیاسی اور عصری رجحان، رومانی رجحان اور معاشرتی رجحان وغیرہ موجود ہے۔

نشاط فاطمہ کے ہاں ماضی کی یادیں دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح ہیں۔ لیکن اس کے بعد طاری ہونے والا احساس مختلف نوعیت کا ہے۔ وقت کی لائی ہوئی تبدیلیاں اور ان سے پیدا کردہ انقلابات سے بعض اوقات ان کے ہاں وقت کی جبریت کا احساس جنم لیتا ہے۔ وقت کی جبریت کے حوالے سے ایک احساس ان کے ہاں یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان ماضی کی یادوں کو فراموش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور حال سے سمجھوتہ کرنے کی

بھرپور کوشش کرتا ہے۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں کم و بیش نتیجہ ایک ہی جیسا نکلتا ہے کہ انسان نا آسودگی اور بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کی تحریروں میں جو چیز واضح طور پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ ارتقاء پذیر ہے۔ سکون کا دوسرا نام موت ہے۔ انسان ماضی کی یادوں کو بھلا کر حال کے لمحوں میں ہی جینے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ مسلسل بدلتے وقت اور بدلتے زمانے نے انسان کی داخلی زندگی کے ساتھ ساتھ خارجی زندگی میں بھی بہت سی تبدیلیاں پیدا کیں ہیں۔ انسان کے باطن اور ظاہر میں انقلاب کی سی کیفیت نے جنم لیا۔ اس انقلاب نے انسان کے طرز فکر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ انسان جان بوجھ کر حقیقت سے منہ موڑ لیتا ہے اور اس کا دکھ مزید بڑھ جاتا ہے۔ ان تمام صورتحال کی عکاسی نشاط فاطمہ نے اپنے افسانوں میں کھلے دل سے کی ہے۔

نشاط فاطمہ نے معاشرتی زندگی کے روزمرہ کے حالات واقعات اور مسائل کو فطری اور حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ انسان کے چھوٹے چھوٹے جذبے اور خوشیاں ان کے افسانوں کی بنیاد ہیں۔ ان کے افسانے زندگی سے قریب تر ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے اندر ایسے واقعات کو بنیاد بنایا ہے جو لوگوں کی حقیقی زندگی میں رونما ہوئے ہیں۔ نشاط فاطمہ نے اپنے گردوپیش کی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کی یادکاری، طبقاتی تقسیم، برسر اقتدار طبقے کی طاقت، جہالت، ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ نشاط فاطمہ کا مشاہدہ بہت وسیع ہے اور ان کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ جہاں ان کے افسانوں میں دیگر موضوعات نظر آتے ہیں وہاں ان کے افسانوں کا ایک خاص موضوع سقوط ڈھاکہ کا المیہ بھی ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے غیر جانبدارانہ اور بے حس انداز سے نہ صرف قلم اٹھایا بلکہ اسے المیے اور سانحے کے طور پر لیا ہے جس نے انسانوں کو اندر سے ہی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

اس المیے نے انسانی محبتوں پر کاری ضرب لگائی۔ اس حوالے سے نشاط فاطمہ کی نظر بہت دور پن اور دوررس تھی۔ نشاط فاطمہ کے افسانوں میں پاکستان سے محبت کا احساس ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اسی کے ساتھ پاکستان کو دولخت کرنے کا المیہ بھی سامنے آتا ہے۔ نشاط فاطمہ ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کی

قائل تھیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں زندہ موضوعات کو لیا ہے۔

برصغیر پر مسلمانوں نے کئی سو سال حکومت کی لیکن نااہل حکمرانوں نے برصغیر کی عوام کو مسلسل نظر انداز کر کے خراب صورتحال پیدا کر دی۔ انتشار اور اقتدار کی لالچ نے سب کچھ گنوا دیا مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ گرا دیے گئے۔ انگریزی حکومت کے علاوہ ہندوں نے بھی مسلمانوں کا جینا دو بھر کر دیا۔ جلد ہی مسلمانوں نے محسوس کر لیا کہ انہوں نے اپنی شناخت برقرار رکھنی ہے۔ قائداعظم اور دیگر رہنماوں کی زیر قیادت بہت سی قربانیوں کے بعد اسلام کے نام پر ایک علیحدہ وطن حاصل کر لیا۔ یہ وطن دو قومی نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا۔ لیکن یہ قوم محض چوبیس سال بعد ہی زبان اور رنگ و نسل کے اختلاف پر لڑنے لگی۔ بھارت نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک کی سرپرستی شروع کر دی۔ ۱۹۷۱ء کو قوم نے ایک المناک سانحہ دیکھا۔ جس کے اثرات تمام محب الوطن پر پڑھے۔ پاکستان اپنے مشرقی حصّے سے محروم ہو گیا۔ مشرقی پاکستان نے بنگلہ دیش کے نام پر علیحدہ وطن بنالیا۔

نشاط فاطمہ نے اپنے افسانوں کے اندر مشرقی پاکستان کے المیے کی تصویر کشی کی ہے۔ ہجرت کا المیہ، محبت کا تصور، مشرقی اور مغربی اقدار کا تصادم، اعلی انسانی اقدار کی بے وقتی، زندگی کے مسائل، سیاسی اور عصری شعور جیسے موضوعات کو اپنے افسانوں کے اندر قلمبند کیا۔ ۱۹۷۱ء سے پہلے کی ملکی، سیاسی، سماجی صورتحال کی عکاسی نشاط فاطمہ نے منفرد انداز میں اپنے افسانوں کے اندر کی ہے۔ نشاط فاطمہ نے برصغیر کی تقسیم اور ۱۹۷۱ء کے واقعات، حالات اور ہجرت کے کرب میں مبتلا لوگوں کی بے بسی اور تکالیف کو بہت قریب سے محسوس کیا۔ اس لیے اس تمام صورتحال کی عکاسی جس طرح نشاط فاطمہ نے محسوس کی ہے اسی طرح کی عکاسی ان کے افسانوں کے اندر نظر آتی ہے۔ انہوں نے افسانوں کے اندر مرکزی اور ضمنی کرداروں کے ذریعے اس دور میں پیش آنے والے حالات واقعات کی عکس بندی بہترین انداز میں کی ہے۔ اسی طرح سقوط ڈھاکہ کے دوران ہجرت در ہجرت سے متاثر ہونے والے بے بس، لاچار اور مجبور لوگوں کی دردناک کہانی کی تصویر کشی کی ہے۔ نشاط فاطمہ نے اپنے افسانوں کے اندر جزوی اور کلی امور کی طرف توجہ دلائی ہے جو سقوط ڈھاکہ کا سبب بنے۔ اسی طرح ان کے افسانوں میں سقوط ڈھاکہ کے نتیجے میں مجموعی طور پر پاکستان کی سیاسی اور معاشی صورتحال کی بھرپور انداز میں

عکاسی کی گئی ہے اور سانحے کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ساری صورتحال ان کے افسانوں میں جابجا اس طرح نظر آتی ہے کہ سقوط ڈھاکہ کی ساری صورتحال واضح طور پر قارئین کے سامنے آجاتی ہے۔

ب) تحقیقی نتائج

نشاط فاطمہ کی منتخب افسانوں کا سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ کرنے کے بعد درج ذیل تحقیقی نتائج سامنے آتے ہیں:-

۱۔ نشاط فاطمہ نے اپنے مرکزی اور ضمنی کرداروں کے ذریعے سقوط ڈھاکہ کے واقعات کو جزوی اور کلی طور پر ایک نئے پیرائے میں پیش کیا ہے۔

۲۔ نشاط فاطمہ کے ہاں نسوانی کردار کے مقابلے میں مردانہ کردار زیادہ جاندار دکھائی دیتے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے واقعات زیادہ تر مردانہ کرداروں سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۳۔ نشاط فاطمہ کے افسانوں کے میں سقوط ڈھاکہ کے دوران ہجرت اور حالات وواقعات کی وجہ سے کسمپرسی کا شکار، غریب اور لاچار طبقے کے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔

۴۔ نشاط فاطمہ نے تقسیمِ ہند اور سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں ان مہاجرین کے المیوں کو موضوع بنایا ہے جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

۵۔ نشاط فاطمہ نے معاشرے کے حقیقی رُخ کی تصویر نے نقاب کرتے ہوئے بناوٹی معاشرے اور بناوٹی لوگوں کے رویوں پر بھرپور طنز کیا ہے۔ یہ طنز سماج، معاشرہ، جاگیر دار طبقے اور نااہل حکمرانوں پر کیا گیا ہے اور بااثر لوگوں کی بے حسی کو اپنے افسانوں کے ذریعے اُجاگر کیا ہے۔

۶۔ سقوطِ ڈھاکہ کی درست انداز میں تفہیم کے لیے عوامی سطح پر پائے جانے والے غم وغصے اور عام افراد کے رد عمل پر مبنی رویوں سے، نسبتاً "متوازن انداز میں روشناس کروایا گیا ہے۔

ج) تجاویز و سفارشات:

درج بالا تحقیقی نتائج کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:-

۱۔ نشاط فاطمہ کے افسانوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں بہت سے اسباب کار فرما ہیں جن کے باعث یہ سانحہ رونما ہوا۔ تاہم ان تمام رازوں کو اب تک بے نقاب نہیں کیا جاسکا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نشاط فاطمہ اور معاصر مصنفین کے اس موضوع پر تحریروں کی چھان بین کر کے سربستہ زاروں کو منظر عام پر لایا جائے۔

۲۔ نشاط فاطمہ نے اپنے افسانوں میں سانحہ سقوطِ ڈھاکہ کے متاثرین کے مصائب کو بیان کیا ہے۔ جس سے اس دور کے حالات وواقعات کی سنگینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے اگر ان کے افسانوں کا تقابل "ابرہیم جلیس کے افسانوں "الٹی قبر" اور "بانگلہ دیش"، مسعود مفتی کے افسانوں "سپنا"، "نیند"، اور "خوش قسمتی" سے کیا جائے تو سقوط ڈھاکہ سے جڑے مزید حقائق سامنے آسکتے ہیں۔

۳۔ اردو ادب میں سقوط ڈھاکہ سے قبل کے حالات کی تصویر کشی "شہزاد منظر" کے افسانے "یوٹوپیا" اور چند دیگر میں کی گئی ہے۔ ادب اور تحقیق کے طالب علموں کو شہزاد منظر کے مختلف افسانوں کا تقابل نشاط فاطمہ کے افسانوں کے ساتھ کرنا چاہیے۔

۴- نشاط فاطمہ نے سقوطِ ڈھاکہ جیسے اہم قومی مسئلے کے ساتھ ساتھ دیگر سماجی اور معاشرتی مسائل کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ فاضل مصنفہ کے ادبی کام پر اس تناظر سے بھی نگاہ ڈال کر تحقیق کی روایت کو آگے بڑھایا جائے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

نشاط فاطمہ، انسان کی تلاش، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء

نشاط فاطمہ، چاند ڈوب گیا، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲

ثانوی مآخذ:

آغا سہیل، پرچم، مشمولہ: ماہ فنون (مدیر: احمد ندیم قاسمی) لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۳۶

ام عمارہ، کس نے کس کو اپنایا، مشمولہ: ماہ فنون (مدیر: احمد ندیم قاسمی) لاہور ۱۹۷۳ء ص ۸۲

ابراہیم جلیس، الٹی قبر، مکتبہ جلیس، کراچی، ۱۹۷۸

اختر جمال، زرد پتوں کا بن، اتحریر، لاہور، ۱۹۸۱ء

افتخار علی شیخ، پاکستان توڑنے والے، المطبتہ العربیہ، لاہور، ۱۹۹۷

انتظار حسین، قصہ کہانیاں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

جنرل کے ایم عارف، ضیاء الحق کے ہمراہ، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

حمزہ علوی، پاکستانی اشرفیہ فوج اور نوکر شاہی، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۴

خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء

رضیہ فصیح احمد، بارش کا آخری قطرہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

زاہد چوہدری، مشرقی پاکستان کی تحریک علیحدگی کا آغاز، شرکت پرنٹنگ پریس روڈ، لاہور، ۱۹۹۶ء

زاہد حسین انجم، ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء، تاریخ کے آئینہ میں، مکتبہ انسانیت، لاہور، ۱۹۹۰ء

زینت افشاں، ڈاکٹر، اردو فکشن پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۱۶ء

سردار شوکت علی، بھٹو ضیا اور عوام، رحمت شاہ آفریدی فرنٹیر پوسٹ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء

سلیم منصور خالد، البدر، ادارہ مطبوعات طلبہ، لاہور، ۱۹۸۵ء

شریف الحق دایم، پاکستان سے بنگلہ دیش ان کہی جدجہد، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، الفصیل ناشران و تاجران کتب لاہور، ۲۰۱۰ء

صفدر محمود، ڈاکٹر، پاکستان کیوں ٹوٹا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء

صفدر محمود، ڈاکٹر، سقوط مشرقی پاکستان، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۷۲ء

عبدالرحمٰن منشی، پاکستان کی قیمت، جاوید اکیڈمی ملتان، طبع اول، جون ۱۹۸۳ء

عبدالخالق، (مرتب) تعارف پاکستان، ناظر پرنٹنگ پریس، کراچی، ۱۹۴۹

علی حیدر ملک، پروفیسر، بے زمین بے آسمان، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۸۶ء

عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء

فرمان فتح پوری، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی طبع اول، ۱۹۸۰

فوزیہ اسلم، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰

قیصر، قیصریٰ، مرتب، وطن کا قرض، ایوان ادبیات، کراچی، ۱۹۹۱ء

کرنل سید مقبول حسین، کیمپ ۴۵، محمود پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، ۲۰۰۵ء

کرنل سید مقبول، زندہ رہے گا پاکستان، اے آر پرنٹرز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

لطیف احمد شیرانی، قرارداد پاکستان، خواجہ رضی حیدر (مترجم) قائداعظم اکادمی، لاہور، ۱۹۸۲ء

لیفٹیننٹ کرنل ذوالفقار احمد خان، حیات جاوداں، نیشنل بک فانڈیشن، کراچی، ۱۹۷۷ء

محمد اصغر خان، جرنیل سیاست میں، س، ن ۱۹۹۳ء

محمد ذاکر، ڈاکٹر، آزادی کے بعد ہندوستان کا ادب، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۱

محمد عاصم بٹ، سال بہ سال، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء

محمد عالم خان، ڈاکٹر، اردو افسانے میں رومانی رجحانات، علم و عرفان پبلی کیشنز، س ن

مسعود اشعر، آنکھوں پر دونوں ہاتھ، خلاقین، ملتان، ۱۹۷۵ء

مسعود مفتی، لمحے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۸

مسعود مفتی، ریزے، اقرا، اسلام آباد، ۱۹۷۹ء

منشایاد، بند مٹھی میں جگنو، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۰ء، ص ۳۳، ۳۴

میجر جنرل اکبر خان، عنایت اللہ، کشمیر کے حملہ آور پنڈی سازش کیس، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۸ء

میجر جنرل (ر) تجمل حسین ملک، میری جدوجہد کی داستان، جنگ پبلی کیشنز ۱۹۹۶ء

وسیم شیخ، ہتھیار کیوں ڈالے؟ غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور، س ن

نورین رازق، ڈاکٹر، پاکستانی خواتین افسانہ نگار اردو افسانے کی روایت کے تناظر میں، دستاویز مطبوعات، لاہور، س ن

مقالہ جات:

امبر شہزادی، نشاط فاطمہ کے ناولوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (مقالہ برائے ایم فل اردو) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۳

بشیر احمد اردو نثر پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات (مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو) اورینٹل کالج، لاہور، ۲۰۰۸

شمائل ریاض، ام عمارہ کی تحریروں میں سقوط ڈھاکہ اور ترقی پسند تحریک کے عناصر (مقالہ برائے بی ایس ادرو) بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۴

عذرالیاقت، بیسویں صدی کی نمائندہ افسانوی نثر نگار خواتین (تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم فل اردو) بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۳ء

نازیہ ملک، پاکستانی اردو افسانے میں عصری آگہی: تجزیاتی مطالعہ (مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو) اسلام آباد، ۲۰۱۰

رسائل و جرائد:

ارشد محمود آصف، اردو افسانہ اور آزادی اظہار کے مسائل، مقالہ (غیر مطبوعہ)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۸

اے حمید، اب جاگتے رہنا ہے، مشمولہ، ماہنامہ فنون (مدیر: احمد ندیم قاسمی) لاہور، ۱۹۷۲ء

الطاف فاطمہ (بہن نشاط فاطمہ) مضمون، نشاط فاطمہ میری بہن، ماہنامہ تجدید نو، نشاط فاطمہ نمبر، ۱۹۹۸، ص۱۹۔ ۲۰

سائرہ ہاشمی، مضمون، ایک تھی نشاط فاطمہ، ماہنامہ، تجدید نو، نشاط فاطمہ نمبر ۱۹۹۸ء

سلیم آغا قزلباش، اردو افسانے کے پچاس سال، ماہنامہ اوراق، لاہور، ۱۹۹۸ء

شہزاد منظر، ادب میں انتہا پسند رجحانات، مشمولہ، ماہنامہ فنون (مدیر: احمد ندیم قاسمی) لاہور، ۱۹۹۱ء

مجیب الرحمٰن شامی، سقوط ڈھاکہ کا حساب (مضمون) مشمولہ: روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۴ دسمبر ۱۹۹۴ء

نثار ترابی، ڈاکٹر، سقوط ڈھاکہ کا سیاسی پس منظر اور غزل میں اس کا تخلیقی فور، مشمولہ دریافت، شمارہ ۱۳، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد